منٹو اور آئلو

شیریں نیازی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

منٹو اور آئلو

شیریں نیازی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔ 110025

پہلی اشاعت	:	1992
دوسری طباعت	:	2010
تعداد	:	550
قیمت	:	-/17 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	692

Minto aur Ailo

by

Sheereen Niyazi

ISBN :978-81-7587-343-8

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی110025

فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099

ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: جے۔کے۔آفسیٹ پرنٹرز، بازار مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی-110006

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

پیارے بچو! علم حاصل کرنا وہ عمل ہے جس سے اچھے برے کی تمیز آ جاتی ہے۔ اس سے کردار بنتا ہے، شعور بیدار ہوتا ہے، ذہن کو وسعت ملتی ہے اور سوچ میں نکھار آ جاتا ہے۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں کی ضامن ہیں۔

بچو! ہماری کتابوں کا مقصد تمھارے دل و دماغ کو روشن کرنا اور ان چھوٹی چھوٹی کتابوں سے تم تک نئے علوم کی روشنی پہنچانا ہے، نئی نئی سائنسی ایجادات، دنیا کی بزرگ شخصیات کا تعارف کرانا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ اچھی اچھی کہانیاں تم تک پہنچانا ہے جو دلچسپ بھی ہوں اور جن سے تم زندگی کی بصیرت بھی حاصل کر سکو۔

علم کی یہ روشنی تمھارے دلوں تک صرف تمھاری اپنی زبان میں یعنی تمھاری مادری زبان میں سب سے موثر ڈھنگ سے پہنچ سکتی ہے اس لیے یاد رکھو کہ اگر اپنی مادری زبان اردو کو زندہ رکھنا ہے تو زیادہ سے زیادہ اردو کتابیں خود بھی پڑھو اور اپنے دوستوں کو بھی پڑھواؤ۔ اس طرح اردو زبان کو سنوارنے اور نکھارنے میں تم ہمارا ہاتھ بٹا سکو گے۔

قومی اردو کونسل نے یہ بیڑا اٹھایا ہے کہ اپنے پیارے بچوں کے علم میں اضافہ کرنے کے لیے نئی نئی اور دیدہ زیب کتابیں شائع کرتی رہے جن کو پڑھ کر ہمارے پیارے بچوں کا مستقبل تابناک بنے اور وہ بزرگوں کی ذہنی کاوشوں سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔ ادب کسی بھی زبان کا ہو، اس کا مطالعہ زندگی کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

بچّو!

آپ نے جِنوں، پَریوں، بھُوتوں، دیووں اور جادو ٹونا وغیرہ کی بہت سی کہانیاں پڑھی یا سُنی ہوں گی، اور شیخ چلّی کی شیخیاں یا گپ بازوں کی گپ بازیاں بھی پڑھی یا سُنی ہوں گی۔ اِن جھُوٹے قِصّوں سے وقت بھی برباد ہوتا ہے اور فائدے کے بجائے نقصان ہی ہوتا ہے۔

اس لیے آئیے ہم آپ کو ایک سچّی اور اچّھی سی کہانی سُنائیں۔ یہ کہانی ایک کوئلے کی کان کی ہے۔ جہاں سے کوئلہ نکلتا ہے۔ کوئلے کی ایک "کان"، بھی ہو سکتی ہے، کئی کئی کانیں بھی۔ کان کو عام لوگ "کھان"، یا "کھدان"، بھی کہتے ہیں۔ انگریزی میں کوئلے کی کان کو "کول مائن"(Coal Mine) کہتے ہیں۔

کوئلہ چونکہ بڑے کام کی چیز ہے اس لیے اسے "کالا ہیرا"، بھی کہتے ہیں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ کوئلہ ہیرا سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ یہ نہ ہو تو ہمارے بہت سارے کارخانے، بجلی گھر اور ہماری بیشمار چھُوٹی بڑی صنعتیں ٹھپ ہو جائیں۔

بے شمار گھروں کے چولھے بھی ٹھنڈے پڑ جائیں۔ ! آپ کہیں گے چُولھے کیوں ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔ ہ گیس کے چُولھے ہیں۔

کراسن تیل سے جلنے والے اسٹوو ہیں، جنگل کی لکڑیاں ہیں ....،
جی ہاں ! یہ تو سبھی پر سب کے لیے نہیں ! گیس اور کراسن
مہنگا بھی تو ہوتے ہیں۔ جنگل چپے چپے میں نہیں۔ جتنے جنگل بچ رہے
ہیں ان کے پیڑوں کو بھی جلانے کے لیے کاٹنا شروع کردیا جائے تو
کچھ ہی دنوں میں جنگل غائب ہو جائیں گے اور جب جنگل غائب
ہو جائیں گے تو غضب ہی ہو جائے گا۔!

ہماری سرکار کی کمپنی ''کول انڈیا'' کی طرف سے جگہ جگہ یہ نعرہ
لکھا ہوا نظر آتا ہے: ''کوئلہ جلائیے، پیڑ بچائیے!''

ہمارے ملک میں کوئلے کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے ——
112 بلین ٹن یعنی ایک کھرب بارہ ارب ٹن۔!

کوئلے کی پیداوار بھارت کے جن جن علاقوں میں ہوتی ہے
ان میں خاص یہ ہیں:

1 جھریا (بہار)
2 کرن پورا (بہار)
3 مشرقی بوکارو اور مغربی بوکارو (بہار)
4 رانی گنج (مغربی بنگال)
5 پینچ کنہاں تا واگھاٹی (مدھیہ پردیش)

۶ سنگرولی (مدھیہ پردیش اور اتر پردیش)
7 چاندہ وار دھا (مہاراشٹر)
8 تالچر (اڑیسہ)
9 وادئ گوداوری (آندھرا پردیش)
۱۰ آسام۔ اور کچھ دوسرے علاقے۔

کوئلے کی پیداوار ہمارے ملک میں دس کروڑ ٹن (سالانہ) سے بھی کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ کوئلہ پیدا کرنے والی سوا چار سو کانیں تو اکیلے "کول انڈیا لمیٹڈ" کے تحت ہیں۔ دوسری کانیں "سنگارینی کوئلریز"، "ٹسکو" اور "اِسکو" کمپنیوں کے ماتحت۔

یہ کانیں دو طرح کی ہوتی ہیں ــــــ کھلی اور زمین دوز۔ زمین دوز کانوں کی بھی دو خاص قسمیں ہوتی ہیں ــــــ سُرنگ نُما اور کنواں نما۔

ہم جو کہانی آپ کو سنانے جا رہے ہیں وہ زمین دوز کان ہی سے متعلق ہے۔

شبّی نامی دس بارہ سال کے ایک لڑکے کی ذہانت اور سُوجھ بُوجھ سے سات (7) آدمی موت کے مُنہ سے زندہ نکل آئے تھے۔ اس لڑکے کے ابّا کوئلے کی ایک سُرنگ نُما زمین دوز کان میں کام کرتے تھے۔

شبّی کا پورا نام محمدؐ شبّیر حسین خاں تھا مگر گھر والے پیار سے اُسے شبّی کہتے تھے۔ اور جن لوگوں کی زبان پر "ش" نہیں چڑھتا وہ اُسے "سبّی" کہتے تھے۔ اور "س" (تشدید) لگانے کی زحمت نہ اٹھانے والے کچھ لوگ، اسے "سبی" ہی کہتے اور کچھ تو چھبی یا چھوی بھی! چھوی ہندی کا لفظ ہے، جس کے معنی تصویر یا شبیہ کے ہیں۔

شبّی جب اپنے ابّا سے نام کی بابت بات کرتا تو ابّا کہتے: "بابو! نام تو میرا بھی ہے محمدؐ تفضّل حسین خاں مگر رہ کیا گیا ہوں؟ فجّو خاں!........ تمہارے دادا اکثر حالتِ مجذوبی میں کہا کرتے تھے: "ایک ایک میاں کے تین تین نام! فضلو، فضل، فضل امام!!.... حسنو، حسن، حسن امام!!! تمہارا نام تو ملک و ملّت، دین و دُنیا سب کے لیے ایک بہترین نمونہ ہے! اور پھر اصل کیا ہے۔؟ اصل تو ہے کام! ہے نا؟ تو تمہارے کام ہی میں تمہارا نام ہے! اور ہماری دعا ہے کہ اللہ تمہیں ایسے اچھّے اچھّے کام کرنے کی توفیق دے جس سے تمہارے ماں باپ، اور بزرگوں، مُلک و ملّت اور خود تمہارا نام روشن ہو!"

شبّی کے ابّا شبّی کی امّی اور شبّی کو ایک دن باتوں ہی باتوں میں بتا رہے تھے۔ "1940 سے پہلے میرے گاؤں کے کئی لوگ کوئلے کی کانوں میں کام کرتے تھے۔ میں جب ۸، ۱۰ سال کا رہا ہوں گا تب ہی سے

کوئلہ کی کان میں کام کرنے والوں کے یہاں جایا کرتا تھا۔ 1952 سے تو
مجھے اتنا ہوش ہو ہی گیا تھا کہ "جھریا کول فیلڈ" کا نام سنوں تو نیا نہ لگے
بلکہ سمجھ جاؤں کہ جھریا کوئلے کی کانوں کے لیے ہی زیادہ مشہور ہے! تو
مَیں یہ بتا رہا تھا کہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کوئلے کی اس دنیا سے میرا رشتہ
1958 سے ہی نہیں بلکہ اصل میں 1952 سے ہے! شروع سے ہی مَیں
"نیشنلسٹ" لفظ سے محبّت محسوس کرتا رہا ہوں۔ یہ محبّت دھیرے دھیرے
میرے ایمان کا ایک حِصّہ ہی بن گئی۔ کتابوں میں بھی "حُبّ الوطن من الایمانّ"
لکھا پڑھتا تو وطن سے محبّت اور پختہ ہوتی جاتی۔

"میرے ایک دوست تھے بادل بابو!"

"کون؟ سُنیا سرکار کے پاپا؟"

"ہاں، ہاں! وہی جو ابھی پچھلے مہینے ہی ریٹائر ہوئے ہیں۔ اُن سے
مَیں اکثر افسوس کے ساتھ کہا کرتا کہ "ہمارے مُلک میں چند ہی ناموں کو
بار بار دہرایا جاتا ہے۔ ملک کے بے شمار لوگوں کو یہ معلوم ہی نہیں کہ قوم پرستوں
میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری جیسے بھی بیسیوں بڑے رہنما تھے..... مولانا
مظہر الحق کے نام پر پٹنہ میں "مظہر الحق پتھ" ہے مگر یہ تھے کون؟ ۹۵ فیصد
سے بھی زائد لوگ نہیں جانتے!" ہر کام میں ایمانداری ہی اصل چیز ہے۔
تعلیم ہو، تحریر ہو یا تقریر و تلقین ہو! مَیں نے اپنے کو نیشنلسٹ کبھی نہیں کہا۔

میری نظر میں تو فجّو بابو! وہ جرمن باشندہ بھی کم قوم پرست نہیں جسے اس کے ملک جرمنی سے اس مقصد کے لیے ہندوستان بھیجا گیا ہے وہ جرمنی کے تعاون سے تیار ہونے والے ہندوستانی کارخانے (راؤرکیلا، اڑیسہ) میں ایمانداری سے کام کرتا ہے۔ اسی طرح روسی تکنیکی ماہرین، پولینڈ کے مائننگ انجینیر، فرانس کے "کوئلہ کان کن" اور دُنیا کے دوسرے ملکوں کے بھی باشندے مُلک میں آئے ہیں اور پوری پوری ایمانداری سے کام کرنے کو ہی اپنا ایمان سمجھا ہے، تو میری نظر میں اپنے اپنے ذمّے کے کام کو پوری پوری ذِمّہ داری سے کرنے کو ہی ایمانداری کہتے ہیں۔

" اچھا بیٹے شبّی! 1958 سے 1988 کے درمیان کے تیس۳۰ سالہ لمبے دور میں نہ جانے کتنے ساتھی رہے ہوں گے میرے، پھر میں نے ایک بادل بابو کا ہی ذکر بطورِ خاص کیوں کیا؟"

ان کی " ایمان داری کے لیے!"

بادل بابو نے ایک پیسے کی بھی کالی کمائی کو حرام ہی سمجھا اور وکرم سنگھ تو اس صف وسط کے اعلیٰ افسر تھے۔ انھوں نے "کالی" کو ہمیشہ "کالی" ہی سمجھا.... ایمانداری نہ کسی افسر کی اجارہ داری ہے، نہ کسی مزدور کی میراث! اتنے بڑے دیش میں اور اتنی بڑی دنیا میں ہر جگہ ایماندار اور بے ایمان دونوں موجود ہیں۔

ریٹائر ہونے سے کچھ ماہ قبل تک انھیں میں جس خستہ حالت میں دیکھتا رہا تھا اس سے دل دُکھتا تھا اور میں خوف بھی کھاتا تھا... کہ...... کہیں ایک دن انھیں جیسا حال میرا بھی نہ ہو! تو پھر یا خدا! میری بیوی، میرے بچّوں کا کیا ہوگا...... ؟"

بادل بابو پر فالج کا حملہ ہوگیا تھا ــــ باپ کی جگہ بیٹے کو کام مل سکتا تھا ــــ کمپنی کے قانون کے تحت۔ مگر اس میں جتنی لمبی دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے وہ بیمار بادل بابو کی بیوی یا بیٹی بیٹے کی بس کی بات نہ تھی۔ پھر یہ بادل بابو کے مزاج کے خلاف بھی تھا، ان کا کہنا تھا جس حق کے لیے بیجا دوڑ دھوپ کرنی پڑے اسے حق کہنا ہی نہیں چاہیئے۔!

شنّی کے ابّا بھی حق حاصل کرنے کے لیے ہر اس دوڑ دھوپ کے خلاف تھے جو بدعنوان، غیر ذمہ دار یا بے ایمان عہدے داروں کے باعث کرنی پڑتی ہو۔ اِسی لیے ان کا اپنا کئی بار کا پرموشن رُکا رہ گیا، کتنے ہی سارے کام پڑے رہ گئے، بے حد تکالیف جھیلیں۔ پھر بھی بادل بابو کے لیے انھوں نے کچھ بابوؤں کے ناز نخرے جھیلے، کچھ صاحبوں کو مسلسل سلام کیے، بات پھر بھی نہیں بنی اور بادل بابو کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ الگ بگڑے: "حق حاصل کرنے کے لیے متعلقہ کارکنوں کے آگے گڑگڑانے کا مطلب کیا ہے؟ ان بے ایمانوں کو اور بے ایمان بنانا!... ایسے میں تو ان کی بے ایمانی کو اور

بڑھاوا ہی ملے گا نا!"

"تب کیا کیا جائے؟ اپنے حقوق سے یونہی محروم رہا جائے!"

"فی الحال تو رہنا ہی پڑے گا!.... نئی نسل سے ہی امید باندھیے، انھیں ایسی تربیت دی جائے کہ جب یہ اپنے ملک کے ان عہدوں پر پہنچیں تو ملک کا کوئی ملازم یا کوئی حقدار ان کے پاس اپنا حق مانگنے آنے کی زحمت میں مبتلا نہیں ہو، بلکہ حق ان کی فائلوں سے نکل کر، میزوں سے چل کر، حقدار کے پاس خود بخود پہنچ جائے!"

بادل بابو کے لڑکے کی نوکری باپ کی جگہ نہ ہونا تھی، نہ ہوئی! بنا پیسے والی میڈیکل چھٹی میں وہ عرصے تک بستر پر بے جان سے پڑے رہے شبی کے ابا کی بھرپور توجہ سے بیماری بڑی حد تک جاتی رہی اور پھر وہ دفتر جانے لگے۔ لڑکا ان کو سہارا دے کر دفتر لے جاتا، اور لے آتا تھا..... ایک طرف ایک ایماندار آدمی کا یہ حال تھا تو دوسری طرف بیسیوں بے ایمان ملازم تھے جو کمپنی کا خزانہ خالی کر رہے تھے اور مفت میں بڑی بڑی تنخواہیں پا رہے تھے۔

شبی کے ابا اِن مفت خوروں سے یوں بھی پریشان تھے کہ ان میں سے دوچار کام چور ایسے بھی تھے جن کے ذمّے کا کام شبی کے ابا کو کرنا پڑتا تھا۔ نہ کریں تو کمپنی کا نقصان ہو اور کمپنی کے نقصان کا مطلب ہوا ملک کا نقصان! اور اپنے ملک سے محبّت کرنے والا کوئی انسان اپنے ملک کے نقصان کو کیسے

برداشت کرسکتا تھا۔؟ سو وہ کام اپنے ذمّے کا بھی کرتے ہی، اور ان مُفت خوروں کے ذمّے کا بھی کردیتے۔

پیارے بچّو! اصل قصّہ سنانے سے پہلے اس علاقے کے لوگوں کی ذہنیت کی جانکاری بھی آپ کو دینی پڑی۔ اب اصل قصّہ بھی سنائیں گے آپ کو۔ ذرا کچھ اور باتیں بھی سُن لی جائیں۔

کوئلری میں کام کرنے والوں کے لیے مختلف قسم کے کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ شبّی کے ابّا کو جو کوارٹر ملا تھا اسے اس کے ابّا، امّی، اور بہنوں نے بڑی محنت سے اپنا "نجی گھر" جیسا روپ دے رکھا تھا۔ کوارٹر کے چاروں طرف تاروں کی باڑھ لگا کر گُل مہر، یوکلیپٹس، شہتوت، آم، اَمرود، انار اور بیر وغیرہ کے پیڑ اور گلاب، چمیلی وغیرہ پھولوں کے پودے لگائے گئے تھے۔

ان میں سے کچھ پودے خود شبّی نے بھی اپنے ننّھے ننّھے ہاتھوں سے لگائے تھے۔!

اِن پیڑ پودوں اور پالے ہوئے پیارے پرندوں کبوتروں، خرگوشوں، کتّوں اور بلّیوں وغیرہ سے شبّی کے گھر والوں کو بڑا پیار تھا۔ مگر ان چیزوں کو اڑوس پڑوس کے بچّے تہس نہس کرنے پر تلے رہتے...... بالخصوص بیر کے پیڑوں کے باعث تو پورے کوارٹر پر قیامت ہی ٹوٹی رہتی... اِدھر

بیر کے پیڑوں میں پھل لگنے شروع ہوتے اُدھر بچوں کے پتھر برسنے شروع ہو جاتے۔!

اور ان شریر بچّوں کے ماں باپ انھیں پتھروں کی بارش کرنے سے روکتے نہیں تھے بلکہ اپنی شیطانی مسکراہٹوں، ہنسیوں، قہقہوں کے ساتھ اُن کی "حوصلہ افزائی" کرتے تھے۔!

پہلے تو بیر کے پیڑ بچ ہی نہیں پاتے، ایک آدھ بار کچھ بیریں بچ گئیں تو شبّی کی ماں نے ایسا کیا کہ بڑی محنت سے ان بیروں کو توڑا۔ پوری ٹوکری بچّوں کے سامنے کرکے کہا:—— لو اب کھاکر دیکھو تو ذرا!" "ہیں نا مزے دار!" —— بچّے کچھ کھا چکے تو شبّی کی امّی نے سمجھایا:——

اسی طرح پکنے دیا کرو تم لوگ ہر سال کچّی کی جگہ پکّی اور میٹھی میٹھی بیریں کھایا کروگے! پتھر برسانے سے نقصان ہی نقصان ہے۔ تمہارے ہی کسی ساتھی کا پھینکا ہوا پتّھر تمہارے ہی کسی ساتھی کی آنکھ پھوڑ سکتا ہے!....."

پَر جن بچّوں کو خود ان کے ماں باپ کی شہ سے اُدھم مچانے کی چھُوٹ ملی ہوئی ہو، ان پر بھلا شبّی کی امّی کے سمجھانے کا کیا اثر پڑنے والا تھا۔؟

بیریں بھی ہڑپ گئے ٹوکری بھر، اور سمجھانے کے جواب میں کچھ تو چپکے سے کھسک گئے، پَر زیادہ تر بندروں کی طرح اُچک پھدک کر دور جا کھڑے ہوئے اور بندروں ہی کی طرح مُنہ چڑھانے لگے.....!

حد یہ کہ کچھ ہی دیر بعد پتھروں کی سنسناہٹ پھر شروع ہو گئی۔!
نتیجے میں شبّی کے گھر کی ایک کھڑکی بھی سلامت نہیں رہی! کھڑکیوں
کے شیشے تو چکنا چور ہوئے، گھر والوں کے بھی سر پھوٹے!
شبّی کے ابّا نے جا کر بچّے کے باپ سے شکایت کی تو اس نے جواب دیا:
"ہاں، ہاں زبان کھولنے کی ضرورت نہیں میاں جی، ہم سمجھ گئے تم
کہنا کیا چاہتے ہو۔؟ پر ثبوت؟ ہے کوئی ثبوت کہ تمھاری گھر والی کا سر
میرے ہی بچّے کے پتّھر سے پھوٹا۔؟ بہت سے بچّے، گلی کوچے میں مارے
مارے پھرتے ہیں، ادھم مچاتے رہتے ہیں، ہو سکتا ہے ان میں سے ہی کسی نے
پتّھر پھینکا ہو....."
شبّی کے ابّا اپنا سا مُنہ لے کر رہ جاتے۔!
ایک بار تو کہنے والے نے یہ بھی کہہ ڈالا: "دیکھو الزام مت لگاؤ خان!
ہو سکتا ہے تمہارے ہی بچّے نے پتھر چلایا ہو یا اس نے خود ہی اپنا سر پھوڑ لیا
ہو....!" اور اس طرح محلّے میں بہت سے لوگ دشمن بن گئے۔
ڈیوٹی میں بھی یہ خواہ مخواہ کے دشمن شبّی کے ابّا کو خود بھی طرح طرح سے
پریشان کرتے اور کچھ بدقماش یونین لیڈروں یا افسروں کے ذریعہ سے بھی
ایذا دینے کی کوشش کرتے۔
مگر ایک افسر شبّی کے ابّا کا بہی خواہ تھا۔ یہ ایک بہت پرانے نڈر منیجر

تھے —— ریٹائرمنٹ کے قریب۔ نام تھا شرما جی۔ شرما جی کو شعر و شاعری سے بھی شغف تھا۔ ایک دن بولے :

"بھئی خان صاحب! مجھے بڑا افسوس ہے کہ میں آپ کو ظالمانہ مشورہ دینے جا رہا ہوں ...."

"ظالمانہ ..... ؟"

"جھگڑے کی جڑ بیر کے پیڑوں کو آپ جڑ سے کاٹ ڈالیں —— نہ رہے بانس نہ بجے بانسری ..... میرا یہ مشورہ ظالمانہ ہے کہ نہیں ؟ اور یہ ظلم بھی کسی اور کے ساتھ نہیں کرنا ہے آپ کو، خود اپنے ساتھ اور اپنے بچّوں کے ساتھ کرنا ہے! میں جانتا ہوں کہ پیڑ پودوں کو آپ کے گھر والے انسان سے کم پیار نہیں کرتے! مگر یہ ظالم دُنیا ..... !"

شبّی کی ماں نے جب سُنا تو بولیں : " اِن پیڑ پودوں کی وجہ سے بھلے ہی ہمیں نقصان اٹھانا پڑے، مگر ہم یہ کبھی نہیں کر سکتے۔ جو پیڑ پودے ہمیں زندگی دیتے ہیں، ہم اُن سے ان کی زندگی چھین لیں !"

شبّی اسکول سے آکر اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرتا کیونکہ محلّے کے اکثر بچّے اس کے دشمن ہو گئے تھے، پھر اس کے ساتھ کھیلتا ہی کون۔ ؟

مگر اللہ سب کے لیے کوئی نہ کوئی راہ نکال دیتا ہے، اس نے شبّی کے لیے بھی نکال دی۔ ایک دن اسکول سے واپسی پر شبّی کی نظر ایک لوہار کے کارخانے

پر پڑی ۔ سُرخ سُرخ انگارے تیار تھے اور اس دمکتی لہکتی اور چمکتی آگ میں لوہے کی ایک بڑی سی سلاخ تپ تپ کر انگاروں جیسی ہی سرخ سرخ اور دہکتی دمکتی نظر آرہی تھی۔ اس لوہے کی سلاخ کو شبّی سے بڑی عمر کا ایک خوبصورت سا، تندرست و توانا لڑکا کاٹ رہا تھا۔ لوہے پر ضرب پڑتی تو اس کے اندر سے باریک باریک چنگاریاں نکلتیں اور ہوا میں پھیل کر غائب ہو جاتیں ....!

شبّی سب کچھ بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ یہ سب اسے بہت اچھا لگا۔!

اسے لگا کہ آسمان کے تاروں کا جھنڈ اُبھرتا اور ڈوبتا جا رہا ہے۔!

اس لوہار لڑکے سے شبّی کی آہستہ آہستہ دوستی ہو گئی۔

وہ وہاں ہر روز جانے لگا۔

اس لوہار کے لڑکے کا نام تھا راحیلؔ۔

راحیل نے اسے بتایا کہ دو برس پہلے جب وہ میٹرک میں تھا اس کے باپ کی اچانک موت کے باعث اسے یہ کام سنبھالنا پڑا تھا کیونکہ اسے اپنے علاوہ اپنی ماں، دادی اور بہنوں کا بھی خرچ چلانا تھا۔ اس نے یہ کٹھن کام کرتے ہوئے میٹرک کا امتحان دیا تھا اور پاس بھی ہو گیا تھا۔ وہ اب دن رات بڑی لگن سے کام کرتا جا رہا ہے کہ پیسے اتنے ہو جائیں کہ وہ آگے اپنی پڑھائی جاری رکھ سکے اور ایک دن کسی کمپیٹیشن میں بھی بیٹھ کر کامیاب ہو سکے!

شبّی تو ابھی چھٹی کلاس میں ہی پڑھتا تھا، بہت پیچھے تھا راحیل سے مگر اسے لگا کہ راحیل اپنے ساتھ ہی اُسے بھی آگے، اور بہت آگے لے جانا چاہتا ہے۔! اس نے راحیل کی صحبت میں بڑی عجیب سی راحت محسوس کی۔! ایک خوش آئند امنگ۔!

انھیں دنوں شبّی کے ابّا نے بادل بابو کے بارے میں اسے جو باتیں بتائی تھیں وہ دل پر نقش ہو چکی تھیں۔ شبّی کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اسے کوئلے کی کان کے کالے ماحول سے دور کسی اچھی جگہ جاکر تعلیم حاصل کرنی چاہیئے۔ مگر باپ کی آمدنی اتنی نہیں۔ کیا کیا جائے۔؟

اس نے سوچا کہ باہر جاکر تعلیم حاصل کرنے کی سکت جب تک پیدا نہ ہو، تب تک راحیل کے لوہار کارخانے میں ہی کام سیکھا جائے۔ راحیل نئے نئے تجربے کرتا رہتا تھا، نئے نئے آلات و اوزار بناتا رہتا تھا۔

ایک دن راحیل نے شبّی کو بتایا ———

" میرے ابّا تمہارے ابّا کی طرح پڑھے لکھے نہ تھے۔ تمہارے ابّا ایک ادیب ہیں اور شاید غربت کی وجہ سے انھیں غلط جگہ کی ملازمت اختیار کرنی پڑی۔ انھیں ملازمت کرنی ہی نہیں چاہیئے تھی۔ ملازمت نہ کرکے صرف قلم کے ہی ہو رہتے تو وہ اپنے اس قلم سے اپنے قوم و ملک کی کہیں زیادہ بہتر خدمت کر سکتے تھے۔ بہرحال! میرے ابّا پڑھے لکھے نہ تھے

مگر انھوں نے ہاتھ کے ہنر میں بڑی مہارت حاصل کی تھی۔ وہ ذات کے لوہار نہ تھے، نہ ہی ہمارے خاندان میں کبھی کسی نے لوہار کا کام کیا تھا۔

" ابّا کو تو راہس دادا نے لوہار بنا دیا۔! راہس دادا نے میرے باپ کو بچپن سے پالا۔ راہس دادا لوہار تھے اور میرے ابّا انھیں بچپن سے ہی "بابا" کہتے تھے، اس ناطے لوگ میرے ابّا کو اور ان کے بعد ہم سب کو لوہار سمجھنے اور کہنے لگے۔!"

" ابّا ویسے بھی ذات پات کے بھید بھاؤ کو مانتے نہ تھے اس لیے وہ برا ماننے کے بکھیڑے میں کبھی نہیں پڑے۔ وہ راہس دادا کی دین ہی تھی کہ ابّا انھیں کی طرح ایک بہترین کاریگر بن سکے تھے اور مجھے بھی اپنی ہی طرح بلکہ اپنے سے بہتر کاریگر بنا دیا تھا۔ انھیں اپنے دماغ سے بنائے گئے ایک عجیب وغریب آلے کے تجربے کی بڑی تمنا تھی،...."

" وہ عجیب وغریب آلہ کیسا تھا۔؟" —— شبّی نے پُوچھا۔

" وہ میں تمھیں دکھاؤں گا۔ اور اس کا استعمال کب اور کس طرح کیا جانا چاہیئے، یہ بھی میں تمھیں سمجھاؤں گا۔"

اور راحیل نے جب دکھایا اور سمجھایا تو شبّی کی حیرت اور خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔!

ایک دن شبّی کے ننیہال گاؤں سے خبر آئی کہ اس کی نانی بہت بیمار ہیں۔

اس کے ابّا نے کہا کہ وہ ماں بہنوں کے ساتھ گاؤں چلا جائے ۔ وہ گاؤں اِس کوئلے کی کان سے تقریباً ۶۰ کلومیٹر دُور تھا۔شبّی سب کے ساتھ گاؤں چلا گیا۔

وہ گاؤں بڑا پیارا تھا۔ وہاں کے بچّے بڑے ہی پیارے تھے ۔ خاصے عرصے سے شبّی وہاں جا بھی نہ سکا تھا۔ اور اب جو گیا تو وہاں سے آنے کا جی ہی نہیں چاہتا تھا۔! اس لیے نانی کے اچھّے ہو جانے کے بعد بھی وہ وہاں رک گیا۔

آموں کے موسم میں کچّی کیریاں ، ناریل کے موسم میں ناریل کا پانی ، گنّے اور شہتوت وغیرہ سب خوب ملتے تھے۔ اس گاؤں میں اور آس پاس کے کچھ اور گاؤں میں بھی۔ کاش ! شبّی ہمیشہ اسی گاؤں میں رہتا ۔ ۔ ۔ ۔ !

شبّی اور اس کی ماں بہنوں کے گاؤں چلے جانے کے بعد کی بات ہے کہ ایک رات بجلی غائب ہونے سے شبی کے ابّا کو بڑی پریشانی اُٹھانی پڑ رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

بجلی تو اکثر غائب رہنے لگی تھی ، اِدھر کچھ برسوں سے۔ مگر آج رات شبّی کے ابّا کو کچھ زیادہ ہی پریشانی ہو رہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بجلی شام سے ہی فیل تھی ۔ شبّی کے ابّا کی رات کی ڈیوٹی (نائٹ شفٹ) تھی۔ ابّا کو کھانا بھی خود ہی پکانا تھا۔ بکھری چیزیں سمیٹنی تھیں ، کئی اور کام کرنے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بجلی نہ ہونے سے بڑی دقّت کا سامنا کرنا پڑا ۔

کسی طرح ابّا نے کھانا تیار کیا، تو اس نے برتن وغیرہ سمیٹے، تھوڑی سی چہل قدمی بھی کی اور پھر بستر پر لیٹ گیا۔

ابّا کے ساتھی "ڈیزل لیمپ" جلائے باہر بیٹھے تاش کھیل رہے تھے اور شور کر رہے تھے............ اُن کو نہ تیل جلنے کی پرواہ تھی، نہ نیند اور آرام کی فکر۔

کیونکہ اس کا تیل مفت میں مہیّا ہوا تھا، اب ایسے میں ان لوگوں کا اپنا ایجاد کردہ "ڈیزل لیمپ" رات بھر بھی جلتا رہے تو کیا فرق پڑتا تھا۔!

نیند اور آرام کا جہاں تک تعلّق تھا ان جیسوں کے لیے تو ڈیوٹی میں آرام ہی آرام تھا! ڈیوٹی میں خرّاٹے بھرنے کی پوری پوری "آزادی" ہو تو ڈیرے میں بستر پر لیٹ کر سونے کی کیا ضرورت۔!

اور شبّی کے ابّا کو تو وہاں جا کر سونا نہیں تھا، کام کرنا تھا۔ لہٰذا وہ ڈیرے میں سوتا تھا ہمیشہ۔ آج بھی وہ بستر پر اسی ارادے سے لیٹا تھا۔ ساتھ ہی ڈر بھی تھا کہ وہ ڈیرے (کوارٹر) میں تنہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سویا ہی رہ جائے اور ڈیوٹی فیل ہو جائے۔!

وہ بستر پر لیٹے لیٹے ایک کتاب پڑھ رہا تھا کہ پتہ نہیں کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

اور جب آنکھ کھلی تو..... تو رات کے بارہ بجنے میں صرف دس منٹ

باقی تھے ......

اور آنکھ شاید کھلتی بھی نہیں، اگر شیشہ ٹوٹنے کے جھناکے کی آواز نہ ہوتی۔ اچانک ہوا کے تیز جھونکے آئے تھے، اور کھڑکی کے شیشے ٹوٹ گئے تھے۔ بیر کے بہانے شرارتی بچوّں نے پتھر مار مار کر جتنے شیشے توڑے تھے اس سے پیسوں کی بربادی اور پریشانی بھی بہت اٹھانی پڑی تھی ابّا اور گھر والوں کو۔ اور کچھ دن پہلے ہی پھر نئے شیشے لگائے تھے ابّا نے تو یہ سوچا تھا کہ اب پھر بچوں نے توڑ دیئے تو نئے نہیں لگاؤں گا، لکڑی کے تختے ہی ٹھکوالوں گا....

شیشے ٹوٹنے کا غم تو ضرور ہوا، مگر خوشی بھی ہوئی کہ نہ ٹوٹتے تو شاید نیند بھی نہ ٹوٹتی اور ڈیوٹی ناغہ ہو جاتی۔!

ڈیوٹی میں حاضری بنانے والے "مائنرس ٹائم کیپر" بھی نخرے انھیں سے کرتے ہیں جو شبّی کے ابّا کی طرح کے شریف یا سیدھے ہوں، ٹیڑھے لوگ بھلے ہی دو دو گھنٹے لیٹ آئیں... بہرحال شبّی کے ابّا کو بڑی فکر تھی کہ ڈیوٹی میں پہنچنے میں دیر نہ ہو جائے، لہٰذا اس نے جلدی جلدی ڈیوٹی کے کپڑے پہنے اور تقریباً دوڑتا ہوا ڈیوٹی جا پہنچا۔

حاضری لگوا کر "کیپ لیمپ" ۔ ایشو کرایا۔ "سیفٹی لیمپ" (حفاظتی بتّی) اور "کیپ لیمپ"، (بیٹری والی بتّی) کوئلے کی زمین دوز کان میں لے کر

جاناپڑتا ہے۔ "حفاظتی بتّی" کی ضرورت ہر طرح کی کان میں نہیں ہوتی، خاص طرح کی کان میں ہی ہوتی ہے۔ مگر بیٹری والی بتی کی ضرورت ہر طرح کی کان میں ہوتی ہے۔ کھلی کان میں صرف رات میں، زمیں دوز کان میں دن میں بھی۔

بتّی گھر یعنی "لیمپ روم" سے "کیپ لیمپ" اِشو کرواکر بشّی کے ابّا نے اسے کمر میں لگی بیلٹ سے باندھا۔ سر پر "مائیننگ کیپ" کے ہُک میں "کیپ لیمپ" کی ٹارچ نُما بتّی کو پھنسایا۔ اس نے اپنے "مائننگ شو" کے فیتوں پر بھی نظر ڈالی کہ وہ درست ہیں کہ نہیں۔ ہاف پینٹ کے اندر شرٹ کے حصے کو بھی اچھی طرح گھسایا۔ ایک ڈنڈا بھی ہاتھ میں لیا۔

اور جب وہ "سُرنگ نما" کان میں اترنے سے قبل اپنی ٹوپی سے لگی ٹارچ نما بتّی کو جلا چکا تو وہ ایک ریل انجن کی طرح دکھائی دینے لگا.... دریل کے اسٹیم، ڈیزل یا بجلی کے انجن کے مُنہ یا سر پر جس طرح لائٹ لگی ہوتی ہے، ویسی ہی لائٹ اس کے سر پر بھی نظر آرہی تھی!)

لیمپ رُوم کے لیمپ اشو ور نے لیمپ دینے میں دیر کردی۔ اس کے آنے تک کچھ لوگ تو اونگھتے رہے، دو چار لوگ معمول کی طرح انتظار کرتے رہے مگر اکثر لوگ بتّی بابو کی بینچ پر بیٹھے بتّی خلاصی سے یہی کہہ کر بتّی لے لے کر چلتے بنے:۔

"بابو آئے تو ہمارا نام لکھا دینا۔ یہاں ٹیم (ٹائم) برباد کرنا نہیں،
اندر جاکر اتنے ٹیم میں ایک نیند تو لے ہی لیں گے نا! ....."

بابو آیا۔ لیمپ اشو رجسٹر پر بتّی کے ابّا کا نام چڑھانے لگا۔ مگر پھر لکھتے
لکھتے رک گیا۔ مسکرا کر "چنوٹی" نکالی جیب سے اور کچّی تمباکو میں چونا ملا کر
ہتھیلی پر رگڑنے لگا۔ بولا: "کھان ساہیب (خاں صاحب) آپ ہی تو
ایک ایسا ورکر ہیں جو نیم کانون کا بڑا پکّا ہیں، اور نہیں تو آج کون مانتا ہے
"مائننگ رول" کو..... لوگ نام لکھائے بنا ہی "دادا گیری" دکھا کر
بتّی لے کر اندر چلے گئے .... اب ایکسیڈنٹ ہو جائے بھگوان نا کرے تو
اُن کا تو کوئی پرمان ریکارڈ رہے گا نہیں .... ہے کہ نہیں؟ اب ہم تو
ان کا نام چڑھا ہی دیتے ہیں رجسٹر پر، نہ چڑھائیں تو مار کھائیں.... ایسا ہی
وہ سوچتے بھی ہیں کہ بابو کو مار کھانا ہے کیا کہ نام نہیں چڑھائے گا..... تو
بھیا کون شریف آدمی ہے جو جھنجھٹ جھمیلے میں پڑنا چاہے۔ یہ داد ٹائپ
کول کٹر، لوڈر، لوگ تو بتّی گھر میں آتے ہی ہلّہ کرتے لگتے ہیں کہ "پہلے ہم کو
بتّی دو!" کیونکہ ان کو اندر جاکر سونے کی جلدی ہوتی ہے ..... اب ہم
اس ہلّا گلّا سے بچنے کے لیے گائب ہو جاتے ہیں...."

بتّی بابو اور بھی بہت سی باتیں کہتا رہا اور پھر یہ بھی کہتا رہا کہ ہر جگہ
کا یہی حال ہے، جگہ جگہ چھید ہے، جھول ہے..... اس بابو کی باتیں سچّی ہی

تھیں حقیقت میں یہی تھا، شبّی کے ابّا کو سب معلوم ہی تھا مگر ابّا آج یہ باتیں سُننا نہیں چاہتا تھا بلکہ جلد سے جلد کان (کھان) کے اندر جاکر اپنا کام کرنا چاہتا تھا کیونکہ دیر ہو رہی تھی۔ مگر اس کے نہ چاہتے ہوئے بھی بتّی والے بابو کی باتوں نے بہت دیر کر دی .....

وہ بتّی لے کر کھان کے دہانے پر پہنچا ـــــ

کھان کے دہانے پر "باڈی سرچر" یونس میاں کی ڈیوٹی تھی۔ یہ بھی اونگھ رہے تھے۔ جب شبّی کے ابّا نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو بھی ان کی غنودگی ٹوٹی نہیں۔ کندھا ہلایا تو.....

یونس میاں نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ بولے:

"سلامالیکم خان صاحب!"

"وعلیکم السلام! میری باڈی چیک کیجئے نا یونس بھائی!"

"آپ کی چیکنگ کیا کرنی ہے خان صاحب؟ آج تک آپ کی جیب تلاشی کی ضرورت پڑی ہے؟ ماچس سلائی تو ان کی جیب میں ہوتی ہے جو بیڑی پیتے ہیں، سگریٹ پھونکتے ہیں....."

"پھر بھی ڈیوٹی تو ڈیوٹی ہی ہے نا!"

"ہاں ڈیوٹی تو ڈیوٹی ہی ہے۔ سو لائیے اِس "بوڈی سرچر" کی ڈیوٹی کے ناطے آپ کی خالی جیبوں کی بھی سرچنگ کر ہی لوں!"

یونس میاں نے یہ کہہ کر شبّی کے ابّا کی شرٹ اور پینٹ کی پاکٹوں کو بے دلی سے ٹٹولا اور پھر اونگھنے میں مصروف ہو گئے !

اب شبّی کے ابّا کو اور کوئی قانونی خانہ پُری کرانی نہیں تھی وہ سیدھے کھان کے اندر جانے کے لیے بنے ہوئے سیڑھی نما راستے سے کوئلے کی سرنگی زمین دوز کھان میں اترنے لگے۔

سیڑھیاں، سیڑھی نما راستہ اور پوری سرنگ نما کھان ہی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی !

"الف لیلیٰ" یا ایسی ہی کئی داستانوں میں جیسے حیرت انگیز اور عجیب وغریب مناظر ملتے ہیں۔ ان سب سے کہیں زیادہ حیرت انگیز، سحر انگیز اور عجیب وغریب مناظر ہوتے ہیں کوئلہ کی اِن زمین دوز کھانوں کے ! یہاں رات تو رات ہی ہے، دن بھی اندھیری رات کی طرح دکھائی دیتا ہے۔

کیپ لیمپ کی روشنی کے سہارے شبّی کے ابّا ہمیشہ کی طرح اندھیری سرنگ میں اترتے چلے جا رہے تھے۔

دُور دُور تک کیپ لیمپ کی ڈھیر ساری روشنیاں یوں نظر آ رہی تھیں جیسے گھُپ اندھیرے آسمان میں بے شمار روشن تارے جھلملا رہے ہوں۔

ایک جگہ شبّی کے ابّا فجّو خاں کو اندھیرے میں ایک اونچا سا سایہ نظر آیا تو وہ ٹھٹک سے گئے۔ !

وہ سایہ نہیں، اونچے اور لمبے تڑنگے قد کا آدمی تھا ——— جبیب کمال
جبیب کمال کل تک فجو خاں کا سب سے اچھا دوست تھا مگر آج کچھ بُرے
لوگوں کے بہکاوے کے باعث سب سے بُرا دشمن بن گیا تھا۔

جبیب کمال اپنے ساتھیوں کی "گینگ" کا "سردار" تھا۔ اور "سردار"
کی نگرانی میں گینگ کے لوگ کوئلے کی پیداواری کام میں جٹے ہوئے تھے۔
خود "سردار" بھی اپنے ذمّے کا کام کر رہا تھا۔

یہ جس زمین دوز کان کا قصّہ ہے وہاں سن 1960 کے آس پاس
بہت ساری مشینیں ہوا کرتی تھیں۔ جیسے "کول کٹر مشین"، جوائے لوڈر
مشین، چین کنویر، بیلٹ کنویر جن پر لوڈر مزدور کوئلہ لادتے تھے اور بجلی
موٹر کی طاقت سے چلنے والے بیلٹ کنویر پر لد کر کوئلہ کان کے اندر سے
باہر آتا تھا۔

آج جس کان میں جبیب کمال وغیرہ کام کر رہے تھے اس میں یہ طریقہ
تھا کہ ریل پٹریاں جو کان کے اندر بنی ہوئی تھیں ان پٹریوں پر کول ٹبوں کی
قطار کھڑی کر دی جاتی تھیں۔ ان ٹبوں میں لوڈر لوگ کوئلہ لاد دیتے تھے۔
سب ڈبے جب بھر جاتے تو کان کے دہانے کے قریب بنے "ہالج" گھر کو
فون جیسی چیز کے ذریعے خبر کر دی جاتی گھنٹی بجتے ہی ہالج مشین کا ڈرائیور مشین
چالو کر دیتا۔ "ڈرم" سے رسّہ کھنچنا شروع ہو جاتا اور لوہے کا یہ رسّہ (روپ)

بٹوں کے ہُک سے جُڑا ہوتا، ٹب اس آہنی رسّے کے سہارے اوپر کھنچتے چلے جاتے۔ اوپر پہنچ کر "ٹپلر" پر کوئلہ اَن لوڈ ہو جاتا تھا..... اَن لوڈ کرانے کا کام "ٹرالی مین" مزدور کرتے اور اَن لوڈ ہو جانے کے بعد خالی ٹب پھر کان میں پہنچا دیئے جاتے۔ اسی "ہالج مشین" کے آہنی رسّے کے سہارے اور یہ سلسلہ تینوں شفٹوں یعنی چوبیسوں گھنٹوں کے دوران یونہی چلتا رہتا ہے ـــــ یعنی اسی طرح کانوں کے اندر سے کوئلہ نکل نکل کر کانوں کے باہر آتا رہتا اور پھر مُلک کے گوشے گوشے میں ٹرکوں یا ریل ویگنوں کے ذریعے سے پہنچتا رہتا ہے۔

اب کانوں کے اندر جو کوئلے کا ذخیرہ ہوتا ہے وہ ریت یا نرم مٹّی کی طرح نہیں ہوتا، وہ چٹانوں کی شکل میں ہوتا ہے۔ چٹانیں بھی کئی طرح کی، کئی قسم کی ہوتی ہیں، کچھ قدرے نرم، کچھ کافی سخت!

ان چٹانوں میں ڈریلنگ مشین کے ذریعے گول اور لمبے سُوراخ کئے جاتے ہیں۔ ان سوراخوں میں بارودی گولے ڈالے جاتے ہیں۔ ڈائنامائٹ طریقے سے بلاسٹنگ کی جاتی ہے، انھیں اڑایا جاتا ہے۔ اور یہ چٹانیں ٹوٹ ٹوٹ کر کافی مقدار میں جمع ہو جاتی ہیں۔

حبیب کماں اپنے گینگ کے ساتھ جہاں کام کر رہا تھا، اس سے کچھ ہی دور پر فجّو خاں بھی اپنے گینگ کے ساتھ کام کر رہا تھا۔

کوئلے کی چٹانی دیواروں میں سوراخ بنانے والے آلے (ہینڈ ڈرِل) چلائے جارہے تھے۔ اور کوئلے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ان سوراخوں سے نِکل نِکل کر نیچے گر رہے تھے۔ کھر کھر کی آواز اس سُرنگی کان کے کافی بڑے حصّے میں گونج رہی تھی ......

سُپروائزری اسٹاف کے لوگ یعنی سینیئر اُوورمین،" مائننگ سردار" وغیرہ اپنے طور پر خانہ پری کر کے کان سے نکل کر باہر جا چکے تھے۔ ان لوگوں کے ذِمّے یہ کام ہوتا ہے کہ وہ جانچیں کہ کوئلے کی چھتوں تک جو سپورٹ دیئے ہوئے ہیں وہ ٹھیک حالت میں ہیں یا نہیں، وہ ڈنڈے سے چھت کو جگہ جگہ سے ٹھوک ٹھوک کر دیکھتے کہ کہیں سے دیوار یا چھت ڈھیلی تو نہیں پڑ گئی ہے ......کوئلہ چٹّان پھٹ کر گرنے والی تو نہیں .... گیس وغیرہ کی چیکنگ کی ذمّہ داری بھی انھیں سپروائزری اسٹاف کی ہوتی ہے۔

فجّو خاں دھیرے دھیرے چلتے ہوئے کوئلے کی ایک چٹّان کی طرف بڑھنے لگا، جہاں لکڑی کی بڑی بڑی اور مضبوط بلّیوں کی مدد سے کوئلے کی ایک بہت بڑی چھت کو گرنے سے روکنے کی کوشش کی گئی تھی۔ کوئلے کی اس چھت کے اوپر ایک اور چھپت تھی جو اس سے تقریباً دس بارہ انچ اُوپر تھی۔

بلّیوں کے اوپر ٹنگی ہوئی چھت جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھ ....

فجّو خاں نے بھی سوراخ بنانے والا آلہ اٹھایا اور قدرے محفوظ ایک دیوار میں سوراخ بنانے لگا۔

کوئلے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس کے جوتوں پر سے ہوتے ہوئے بھر بھر نیچے گرنے لگے.....

ایک بڑی زور دار اور غیر معمولی آواز ہوئی۔!

اور فجّو خاں کی پنڈلی میں ایک چھرا سا گھس گیا ——— اور فجّو خاں کو تو ایسا ہی لگا۔!

فجّو خاں کے قدم جیسے اس اچانک حملے سے لڑکھڑا گئے.....!

اس نے اپنے حواس کو سنبھالا اور سامنے کی طرف دیکھا جہاں حبیب کمال کام کر رہا تھا تو اس کے منہ سے چیخ نکل گئی ———!"

فجّو خاں کی پنڈلی میں کوئلے کا ایک لمبا نوکیلا ٹکڑا گھس گیا تھا اور یہ ٹکڑا ہو نہ ہو حبیب کمال ہی طرف سے آیا تھا! تو کیا حبیب ڈیرے کی دشمنی کا بدلہ ڈیوٹی میں اس جان لیوا حملے کی شکل میں لے رہا ہے...؟.... یہ کیتی اوچھی حرکت ہے....؟ فجّو خاں نے سوچا اور اسے بڑا صدمہ ہوا۔!

مگر نہیں، حقیقت تو کچھ اور ہی تھی۔!

اصل میں ہوا یہ تھا کہ کوئلے کی اس کان کی چھت میں ایک سوراخ سے تیز دھار کے ساتھ کہیں سے پانی آنا شروع ہو گیا تھا.....!

اور پانی کے اچانک اچانک آجانے کی وجہ سے کوئلے کا وہ بڑا سا ٹکڑا پانی کے زور کی تاب نہ لاکر کوئلے کی پَرت سے نکلا اور تیر کی طرح آکر فجوّ خاں کی پنڈلی میں پیوست ہوگیا۔!

کان میں اچانک ہی یہ پانی کہاں سے آکر بھرنے لگا تھا.....؟

فجوّ خاں کو حیرت اور پریشانی بھی ہوئی اور بڑی شدید فکر بھی۔!

کیونکہ یہ تو شدید ترین خطرے کی کھلی ہوئی گھنٹی تھی۔!

کان میں اچانک پانی آنا شروع ہوا تو وہ رُکا نہیں بلکہ بڑھتا ہی گیا۔!

لگا کہ یہ کان تو پانی سے بھر جائے گی.....

اور فجوّ خاں کو خطرہ نظر آنے لگا کہ پانی جس رفتار سے آرہا ہے، کہیں یہ کان جھیل نما کنواں نہ بن جائے، اور ہم سب اس میں غرقِ آب نہ ہوجائیں .... یہ کان میری اور میرے بہت سارے کامگار ساتھیوں کا قبرستان نہ بن جائے....!

حبیب کمال موڈ میں ہوتا تھا تو کام کرنے کے علاوہ اسے کسی اور چیز کی خبر نہ ہوتی تھی، سو وہ اس وقت بھی اِس بات سے بے خبر ہی تھا کہ کان میں کہیں سے پانی آآکر بھر رہا ہے۔

ارے کم بخت! کیا سو رہا ہے؟ کام کرتے کرتے بھی کیا تجھ پر غنودگی طاری ہے؟ تجھے خبر ہی نہیں یہاں کیا ہو رہا ہے؟ کون سی بلا آرہی ہے..."

فجّو خاں کی باتیں حبیب کمال نے اَن سُنی کردیں، شاید اس خیال سے بھی کہ فجّو تو اس کا دشمن ہے کچھ بھی بک سکتا ہے ....

فجّو خاں نے اپنی ان باتوں کا اثر نہ دیکھا تو حبیب کمال کو جھنجھوڑا۔

" ارے کمال میرے بھائی! آنکھیں تو کھول! دیکھ کان میں پانی بھر رہا ہے .... جلدی سے نکل بھاگ یہاں سے!"

حبیب کمال نے فجّو خاں کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا بس بیوقوفوں کی طرح اس کا منہ تاک کر ہی رہ گیا۔!

کمال کی سمجھ میں خطرے کی بات اس وقت آئی جب اس نے دیکھا کہ فجّو خاں نے پانچ منٹ کے اندر اندر تمام مزدور ساتھیوں کو اکٹھا کرلیا ہے۔!

سب لوگ اپنی تمام طاقت اور کوشش سے کوئلے کے ٹکڑے اٹھا اُٹھا کر اس سُوراخ میں بھرنے لگے جس سے پانی تیز دھار کی طرح ابل رہا تھا۔!

کوئلے کی چٹانیں اب گھوں گھوں کی آواز کرتی زور زور سے ہل رہی تھیں .....

اگر یہ چٹانیں گر جاتیں تو فجّو خاں کے ساٹھ پینسٹھ ساتھیوں کو ایک لمحے کی بھی مہلت نہ ملتی اور وہ سب کے سب زندہ ہی دفن ہو جاتے۔!

پانی تیزی سے بڑھتا جا رہا تھا۔!

اور اب یہ پانی گھٹنوں کو چھونے لگا تھا۔!

فجو خاں اپنے دو ساتھیوں کی مدد سے تمام لوگوں کو بوریوں کی طرح گھسیٹ گھسیٹ کر اوپر جانے والی سیڑھیوں پر پھینکتا جا رہا تھا۔!

لیکن اب یہ پانی سر سے اونچا ہوتا نظر آ رہا تھا اور کان کی سیڑھیوں تک چڑھتا کان کے منہ تک جا پہنچا تھا۔!

اب کوئی راستہ نہ تھا۔!

باہر نکلنے کا راستہ بالکل بند ہو چکا تھا یعنی لبالب پانی نے بند کر ڈالا تھا!

اور سات کوئلہ کامگار نکل نہیں پائے تھے، وہ کان کے اندر ہی رہ گئے تھے۔!

اور ان ساتوں میں ایک حبیب کمال بھی تھا۔

یہ ساتوں زمین کی سطح سے تقریباً سو فیٹ نیچے اور پچاس فیٹ موٹی کوئلے کی چھتوں کے نیچے پھنسے ہوئے تھے۔!

ان کے نیچے اتھاہ پانی اور گہرا اندھیرا تھا۔!

اوپر ڈیڑھ سو فیٹ موٹی چھت۔!

نہ وہ نیچے جا سکتے تھے، نہ اوپر آ سکتے تھے۔!!

دور دور تک یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔!

وائریس پر وائریس ہونے لگے۔ فورسیں بلالی گئیں مگر کسی کو کوئی راستہ نہ سوجھ رہا تھا کہ ان ساتوں کو پانی سے لبالب بھری ہوئی کان سے باہر نکالا جائے تو کیسے ؟

پانی کان کے اندر سے نکالنے کی کوششیں شروع ہوگئیں ، کافی طاقت والے پمپ بٹھا دیئے گئے..... مگر پانی تھا کہ ختم نہیں ہوتا تھا! تمام کوششیں ناکام ہوتی نظر آرہی تھیں....

اب صبح ہو چکی تھی۔

شبّی جب ننیہال سے لوٹ کر اپنے گھر پہنچا تو صبح کے سات بج رہے تھے.

نو بجے اسے اسکول پہنچنا تھا۔

گھر میں تالا لگا ہوا تھا۔

کھانے پینے کی چیزیں اندر بند تھیں۔ کھائے بغیر بھی اسکول چلا جائے تو اسکول ڈریس کہاں سے لائے ؟ ڈریس بھی تو بابا کے آنے کے بعد ہی ملے گا۔ بابا (ابّا) کبھی کبھار ہی ۸ بجے آتے تھے ورنہ ان کے گینگ کے ذمّے جو کام تھا اس سارے کام کو وہ ۶ ، ۶½ صبح تک اکثر ہی نمٹا لیتے تھے اور سات ساڑھے سات تک لوٹ آتے تھے۔

پر اب تو آٹھ بجنے والے ہیں ، بابا ابھی تک لوٹے کیوں نہیں۔؟

وہ پریشانی محسوس کرنے لگا......

پھر وہ گھر میں جو سب سے اونچا نیم کا درخت تھا اس پر چڑھ گیا اور کچھ دیر تک اِدھر اُدھر نظر دوڑاتا رہا۔

پھر نہ جانے کیا سُوچ کر وہ اپنے ابّا کی ڈیوٹی والی جگہ کی طرف چل دیا۔

ڈیوٹی والی جگہ پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کا بابا، اس کے ابّا حیران و پریشان بکھرے بالوں اور تھکے ہوئے اعصاب کے ساتھ بھیڑ میں کھڑے ہوئے ہیں۔! شبّی کے دو اور پڑوسی نیم بیہوشی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔! پانی سے بھرتی ہوئی کان کے دہشتناک منظر نے ان کے ہوش گم کر دیئے تھے۔

ہسپتال سے ایمبولینس آنے والی تھی...... اِن باتوں کا شبّی کو بھیڑ میں کھڑے ہوئے لوگوں سے پتہ چلا۔ دریافت کرنے پر بچہ سمجھ کر اس کی کسی بات کا جواب دینا لوگوں نے ضروری نہ سمجھا۔ تاہم اسے حالات کا علم ہو ہی گیا تھا۔ اور شبّی کا ننّھا معصوم دل یہ سوچ سوچ کر انتہائی پریشان ہو رہا تھا کہ جو سات افراد کان کے اندر ہی رہ گئے ہیں، وہ کس حال میں ہوں گے۔؟ ان پر کیا بیت رہی ہو گی۔؟

شبّی کو سب سے زیادہ فکر حبیب چاچا کی تھی، جن کے دونوں بڑے بیٹے تو آفت کے پرکالے تھے، مگر جن کی چھوٹی بٹیا "مُنّی" بڑی پیاری تھی۔۔ جھگڑا لگائے بِنا جن لوگوں کا کھانا ہضم نہیں ہوتا، انھیں نے جھگڑا لگا کر ایسی

صورتِ حال پیدا کر دی تھی کہ شبّنّ مُنّیّ کے ساتھ کھیلنے تو کیا ملنے سے بھی محروم کر دیا گیا تھا......

"اُف کتنے دن ہو گئے، مُنّی کے ساتھ کھیلے ہوئے ......!"

شبّی یہ خیال آتے ہی بڑا اداس ہو گیا.....

کچھ دیر تک شبّی جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ پھر دھیرے دھیرے چلتا ہوا اپنے ابّا کے پاس پہنچا۔

اور دھیرے سے ابّا سے کچھ کہا۔

ابّا اس کی بات سنتے ہی چونک اُٹھا۔!

فجّن خاں (شبّی کے ابّا) کے لیے یہ بات حیرت ہی کی تھی کہ اتنے سارے بڑے بڑے دماغ والے یہاں موجود ہیں مگر کسی کے دماغ یہ خیال نہیں آیا، جیسا کہ دس سالہ لڑکا شبّی کے ذہن میں آیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک تو شبّی کو بے یقینی سی کیفیت میں دیکھتے رہے پھر ان کے دل میں بات آئی کہ اللہ اگر اس تدبیر سے لوگوں کی جان بچالے تو کیا عجب۔!

لہٰذا انھوں نے اللہ کا نام لے کر اس سینئر انڈر مینیجر شرماجی سے اس کا ذکر کیا، شرماجی فجّن خاں کی بات کو غور سے سنتے تھے۔ شرماجی نے سُنا تو ان کی تو جیسے باچھیں ہی کھل گئیں۔

شرماجی نے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ کو، انھوں نے پروجیکٹ آفیسر کو،

اور پھر اس نے ایریا جنرل منیجر کو یہ سب بتایا.... سن کر سب کو سوفی صد
کامیابی کی امید تو نظر نہ آئی، مگر ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کافی ہوتا ہے۔
فجو خاں کے بچّے کی بتائی ہوئی ترکیب پر عمل شروع کر دیا گیا.....

یہ ترکیب بالکل نئی تھی۔ اس عجیب و غریب ترکیب پر عمل کرنے کی
جیسے ہی حکّامِ بالا اور چیرمین صاحب سے اجازت مل گئی حادثے والی کان
سے متعلقہ زمین میں ڈیڑھ انچ گولائی کا سوراخ بنایا جانے لگا ـــــ یہ
سوراخ ڈیڑھ سو فٹ کی گہرائی تک کرنا تھا، اور کیا گیا۔

اس ڈیڑھ فیٹ گہرے سوراخ میں برقی تار سے جڑی چونگے جیسی چیز
ڈال دی گئی ـــــ یہ ماچس کی ڈبیا پر دھاگا باندھ کر دور تک آواز پہنچانے
والے بچوّں کے کھیل کی طرح تھا۔!

مگر یہ کھیل نہیں تھا۔!

اس پر تو سات آدمیوں کی جان کا انحصار تھا۔!

اور بظاہر طفلانہ اور بچکانہ نظر آنے والے اس آلے کے ذریعہ سے
یہ معلوم ہوگیا کہ وہ ساتوں ابھی زندہ ہیں، قبر نما اتنی گہری، گھپ اندھیری کان
میں بھی اب تک زندہ ہیں تو لوگوں کی خوشیوں کا ٹھکانا نہ رہا..... ترکیب
پر عمل کرنے والے کے جوش و خروش بھی کئی گنا بڑھ گئے۔!

" صاحب جی، ہمارا مرد لوگ ابھی جندہ ہے، جندہ ہے! صاحب جی

ان کو کیسے بھی ہو اندر سے نکالو.....!!—— ساتوں کے خاندان کے لوگ بالخصوص ان کی بیویاں، ان کے بچّے اپنی اپنی زبان میں اپنے اپنے طور پر فریاد کر رہے تھے.... اور صاحب لوگ (افسران) انھیں جتنی تسلّی دے سکتے تھے، دے رہے تھے۔!

شبّی نے ابّا سے کہا کہ ڈیڑھ انچ والے سُوراخ کو اور چوڑا کیا جائے تو لوگوں کی جان بچائی جا سکتی ہے۔ یہ مشورہ دے کر وہ راحیل کے پاس پہنچا۔

چونکہ شبّی کی بتائی ہوئی پہلی ہی ترکیب کامیاب رہی تھی، اسی لیے اس کی بتائی ہوئی دوسری ترکیب یعنی بڑی گولائی والے سوراخ بنانے کے کام پر بے چون وچرا عمل شروع کر دیا گیا تھا۔

اور اب یہ سُوراخ پھیل کر اتنی گولائی اختیار کر چکا تھا کہ اپنے ہاتھ پیر بالکل سیدھے سمیٹ کر ایک تندرست و توانا آدمی بھی آرام سے اس میں گھُس سکتا تھا۔

کئی گھنٹے گذر گئے۔!

وقفے وقفے سے کان کے اندر پھنسے ہوئے ان ساتوں افراد کی خیریت معلوم کی جاتی رہی۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ اس سُوراخ سے اندر کے آدمی باہر کیسے نکلیں گے۔؟

.... اور دوسرا دن شروع ہوگیا۔!

سب لوگ نڈھال اور بے حال ہو رہے تھے۔!

پہلے نکالے جانے والے ہسپتال میں تھے، ان کے جسموں پر کھرونچ خراش اور ہلکی چوٹیں تھیں، جن کا علاج ہو رہا تھا۔

گھڑنگ... گھڑنگ... گھڑنگ... کی آوازیں ہوئیں اور سب لوگ اس طرف دیکھنے لگے۔!

شبّی اور راحیل اپنے چار پانچ ساتھیوں سمیت ٹھیلے پر سے ایک لمبا ڈرم اتر وا رہے تھے۔ اس میں اوپر ڈھکن تھا، سامنے کھڑکی جیسے دروازے تھے۔ اور زنجیر لگانے کے لئے ہک بنے ہوئے تھے۔ اس عجیب و غریب آلے کی گولائی قریب ۲۴ انچ تھی۔

"یہ .... یہ کیا ہے۔؟؟" سب کے چہرے پر سوالیہ نشان تھے۔!

"یہ لوہے کا کمرہ ہے!" شبّی، راحیل اور ان دونوں کے دوستوں نے بتایا۔

"لوہے کے اس کمرے کو لوگ حیرت سے دیکھنے لگے۔ اس میں تمام حفاظتی سامان موجود تھا۔ شبّی نے کہا۔ "اب دیر نہ کریں اور اسے سوراخ کے اندر اتاریں .... !"

کنوئیں میں بالٹی ڈالنے کے لئے جس طرح پہئے جیسی چیز ہوتی ہے اور

اس پہیے پر بالٹی بندھی رسّی ہوتی ہے جو پھسلتی ہوئی نیچے جاتی ہے اور پھر پانی سے بھری بالٹی کو اوپر اسی رسّی کے سہارے کھینچتے ہیں۔ شبّی، راحیل اور ان کے ہونہار ساتھیوں نے اس جادوئی آہنی کمرے کو ۲۴ انچ گولائی والے سوراخ سے اندر اتارنے اور پھر کھینچنے کی ساری ترکیب کمپنی کے کچھ تیز دماغ ذہین تکنیشینوں و انجینیئروں کو سمجھایا۔ جب یہ تکنیشین اور انجینیئر ساری باتوں کو اچھی طرح سمجھ گئے تو انھوں نے اس پر عمل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ بھیڑ میں شامل لوگ مذاق اڑانے کے انداز میں کہہ رہے تھے: " یہ فجّو خاں کا لڑکا اور اس کا ساتھی لوگ یہ کون سا نوٹنکی کر رہا ہے "۔ ان مسخروں کو انجینیئروں نے ڈانٹ دیا:

" آپ لوگ چپ چاپ دیکھیں کہ ہمارے دیش کے یہ ہونہار بچّے کیسا کمال کر رہے ہیں۔!"

سوراخ میں اس آہنی کمرے کو اتارنے کے کام میں کمپنی کے ان باصلاحیت تکنیشینوں اور انجینیئروں نے بھی شبّی اور اس کے ساتھیوں کی بڑی مستعدی سے مدد کی۔

آلہ سوراخ سے اترتا ہوا نیچے جا پہنچا۔!

اندر فون نما چونگا پھر گونجا ـــــــ اس بار اس میں اوپر سے نیچے والوں کے لیے شبّی بول رہا تھا:۔

" آپ لوگوں کو چاچا جی، شبّی کا اور ہم سب بچّوں کا سلام!.......

دیکھئے آپ لوگ ذرا بھی گھبرائیں گے نہیں۔ آپ ایک ایک کر کے اس کمرے میں آجائیں....،،

نیچے اتھاہ پانی اور اوپر کوئلے کی کالی مہیب چٹان اور ان سب کے بیچ یہ عجیب وغریب سی چیز: ——— اندر والے خوف وہراس سے بے حال تو پہلے ہی ہو رہے تھے اور اب اس عجیب وغریب آلے نے اور بھی بُرا حال کر دیا تھا....

کنواں نما قبر میں قید یہ قیدی اپنی اپنی علاقائی زبانوں میں جو بھی باتیں کر رہے تھے ان سب کا نچوڑ یہی تھا:۔" اب تو موت میں کوئی شک ہی نہیں!"

اوپر والوں کو اندر والوں کی طرف سے نہ کوئی جواب ملا اور نہ ہی کسی قسم کی حس وحرکت محسوس ہوئی تو ان سبھی اوپر والوں کو سخت تشویش ہوئی۔!

چونگے کے ذریعے اوپر سے آواز دی گئی:

" آپ کہاں ہیں؟.... کیا آپ میں سے کوئی اس کمرے میں آچکا ہے؟"

"نہیں....نہیں....،، ہلکی ہلکی، گھٹی گھٹی آوازیں اندر سے زمین کی اوپری سطح تک تھرتھرائیں....

"یہ آپ ہی کے بھلے کے لیے ہے۔ ہم آپ کو بچانا چاہتے ہیں۔اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں باہر نکلنے کا۔!،،

مگر کمرہ اب بھی خالی تھا۔!

اوپر کھڑے لوگوں نے پریشانی اور بے بسی کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔!

" اب تو ایک ہی راستہ ہے "۔ راحیل کچھ سوچتا ہوا بولا۔" اور وہ راستہ یہ ہے کہ اندر پھنسے لوگوں کو اطمینان دیقین دلانے کے لئے کہ وہ اس کمرے کے اندر زندہ رہ سکتے ہیں، ہم میں سے کسی ایک کو اس میں بیٹھ کر اندر جانا ہوگا اور پھر اُوپر آکر جو لگے والے فون کے ذریعہ اندر والوں کو بتانا ہوگا کہ دیکھو ہم زندہ اوپر پہنچ گئے ہیں۔!"

" میں جاؤں گا اندر !" شبّی جلدی سے بول پڑا اور جانے کو واقعی تیار ہو گیا۔!

" نہیں، نہیں بیٹے تم نہیں۔!" فجّو خاں گھبرا گئے۔!

" مجھے کچھ نہیں ہوگا ابّا ! مجھے جانے دیں !"

" نہیں بَبُّو (بابو) تو ضد نہ کر ! تو نے اپنی سُوجھ بُوجھ سے اتنا کر دکھایا اب اپنے بابا کو بھی کچھ کر دکھانے کا موقع دے۔!"

لوگ فجّو خاں کو روکنے میں ناکام رہے۔

" بچ گیا تو اس سے بڑا کام اور کیا ہوگا ...."

" ہاں بچ گیا، اندر جاکر صحیح سلامت واپس آگیا تو واقعی یہ ہمارے کوئلہ کان کی تاریخ کا بہت بڑا واقعہ ہوگا ! ایک کرشمہ ! اور ... بچ نہیں پایا تو ان

ساتوں کے ساتھ یہ آٹھواں بھی زندہ درگور ہو جائے گا.....!"۔۔۔۔دو چار لوگوں نے ایسی چہ میگوئیاں کیں۔!

فجو خاں نے جب اس کمرے میں خود کو داخل کیا تو مینیجر مہتا صاحب کے ماتھے پر پسینے تیرنے لگے .... سب کی سانسیں رُک سی گئیں .... فورس کے جوان کچھ اور چوکس ہو گئے۔ کمرے کے اندر گھُس جانے کے بعد فجو خاں نے اپنا ہاتھ اوپر کیا اور انڈر مینیجر شرما جی جیسے بیسیوں مخلص لوگوں کی آنسو بھری آنکھوں نے فجو خاں کو الوداع اور خدا حافظ کہا۔!

گہرے گھُپ اندھیرے میں لمبوترہ و گول کمرہ فجو خاں کو اپنے اندر چھپائے نیچے اترتا چلا گیا۔!

لوہے کا یہ مخصوص کمرہ کان کی گہرائی میں پہنچ کر پانی کے اوپر غڑاپ سے گرا اور پھر اوپر اچھل کر گیند کی طرح لڑھکنے لگا۔!

کئی چکر کھا کر وہ ایک چٹان سے ٹکرا کر گول گول گھوما اور پھر رک گیا۔

فجو خاں کو لگا کہ کسی گہرے سمندر میں کوئی جہاز ہچکولے کھا رہا ہے.....!

کان میں چھپی چودہ آنکھیں سہمی سہمی سی یہ نظارہ دیکھ رہی تھیں! اور وہ آنکھیں پھر کھلنے کی طاقت جیسے کھو بیٹھیں۔!

اس وقت کھٹ سے کھڑکی نما دروازہ کھل گیا۔ اور جس طرح ہوائی جہاز سے اترنے کے لئے سیڑھی لگائی جاتی ہے، ویسی ہی سیڑھی نیچے

آکرٹک گئی۔!

پھر اندر سے ایک سایہ نکلا اور سیڑھی سے اترنے لگا۔ قریب پہنچ کر اس نے کہا۔

"تم زندہ ہو دوست! چلو اٹھو، لوٹ چلو اپنی اس دنیا میں جہاں صبح کے سورج کی کرنیں تمھارا انتظار کر رہی ہیں.... اور جہاں بڑی بے چینی سے تمھارے بیوی بچے، اور رشتہ دار تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔

کمرہ ایک بار پھر اوپر آیا۔!

کان کے اوپر آدمیوں کی سانسیں جیسے رُک سی گئیں۔

"فجو خاں!....." تمام لوگ ایک ساتھ پکار اُٹھے۔!

لیکن اس جادوئی کمرے کے اندر سے نکلنے والا وجود رمضو کا تھا۔ وہ اُن سات آدمیوں میں سے ایک تھا جو "کالے ہیرے کے سنسار" کی اس سرنگ نما کنویں کے قیدی بن گئے تھے۔

اندر سے آنے والے اس شخص میں کچھ بولنے بتانے کی سکت نہیں تھی....!

ایمبولینس حرکت میں آ چکی تھی۔!

اِس طرح ایک کمسن بچے شبنی اور اس کے ساتھی راحیل کی عقلمندی اور بروقت اور برمحل سوجھ بوجھ سے ایک ایک کر کے ساتوں آدمی بچا لیے گئے!

سب میں آخر میں فجو خاں اوپر آئے تھے۔!

اندر رہ کر انھوں نے ان ساتوں کو کمرے میں کھڑا کرنے میں ان کی مدد کی تھی کیونکہ وہ لوگ نیم مُردہ یا کہا جائے کہ بالکل بے جان ہو رہے تھے۔!

اُوپر آتے ہی فجو خاں اللہ کے حضور سر بسجود ہو گئے اور ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگی:

اے خدا جس طرح تو نے اپنے اِن بندوں کو نئی زندگی دی ہے اسی طرح ان زندگیوں کو ان کے بال بچوں کی اچھی پرورش اور ملک وقوم کی خدمت کی توفیق عطا فرما.... اور میرے بچے شبّی کو ایسی توفیق عطا فرما تاکہ وہ زندگی بھر دوسروں کا بھلا کرتا رہے، قوم و مُلک بلکہ پوری دنیا کے لیے اپنی اعلیٰ تر۔ن سوجھ بوجھ سے ملک کی خدمات انجام دیتا رہے۔!"

اُن تمام لوگوں کا جو قبر نما کان سے زندہ اور صحیح سلامت بچ کر نکل آئے تھے۔ اچھا علاج کروا گیا۔ اور انھیں کمپنی کی طرف سے تین مہینے کی تنخواہ کے برابر بِلا کام پیسے دیئے گئے۔ انھیں انعام سے بھی نوازا گیا کہ وہ کمپنی کی طرف سے خاص چھٹی سے استفادہ کر کے ملک کے مختلف قابلِ دید مقامات کی سیر و تفریح کریں۔!

مگر میرے وطن کے پیارے بچو۔! کیا تمہارے دل میں یہ بات نہیں آ رہی ہے کہ انعام کے حقدار تو راحیل بھی تھے، فجو خاں بھی اور سب سے بڑھ کر شبّی۔!

انڈر منیجر صاحب شرما جی نے جب یہ واقعہ سُنا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ ایک انجینیئر نے جو عمر رسیدہ تھے کہا: "پوری بات سمجھ میں آگئی کہ راحیل کے باپ نے اپنی زندگی میں بڑی دور اندیشی سے کام لے کر یہ آلہ ایجاد کیا تھا کہ اگر خدانخواستہ کان سے نکلنے کے تمام راستے بند ہو جائیں تو اس کی مدد سے کان کے اندر پھنسے ہوئے لوگوں کو باہر نکالا جا سکے۔"

مائننگ انجینیئر صاحب نے جن کا نام جے این سنگھ تھا راحیل کو پکارا۔ راحیل ان کے قریب آیا۔ انھوں نے شبّی کو بھی اپنا ہاتھ بڑھا کر اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔

"دیکھو بیٹے راحیل تم اتنے دنوں تک اپنے لوہے کے کارخانے میں کام کرتے رہے۔ تمہاری صلاحیتوں کا ہمارے ملک کو پورا پورا فائدہ پہنچنا چاہیئے۔ اس کے لیے تمھیں صحیح جگہ صحیح کام کرنے کی ضرورت ہے۔ میں تمہیں اپنی اس کوئلہ کمپنی میں معقول ترین ملازمت دلاکر ہی دم لوں گا۔!"

پھر "جے۔ این سنگھ"، شبّی کا کندھا انتہائی شفقت سے تھپتھپاتے ہوئے بولے:۔" اور پیارے شبّی! تم فخرو خاں کے ہی بیٹے نہیں ہو۔ تم میرے بھی بیٹے ہو سب کے، پورے مُلک کے۔! میں تمہیں ایک "دیش پُتر"، کے روپ میں دیکھ رہا ہوں۔ اور تم ایک دن اس دیش اور دنیا میں اپنا اور اپنے بزرگوں کا نام روشن کرو گے۔!

آج سے میری کمائی کا کم از کم پانچ فی صد حصّہ شبّی کی تعلیم کے لیے وقف ہوگا۔! اس پیسے سے ہمارا لڑکا اچھی تعلیم حاصل کر سکے گا۔

اور شبّی میاں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ کان کے اندر سے سات آدمی کیا نکلے تھے، گویا ایک تاریک اور مہیب قبر سے زندہ انسان باہر نکل آئے۔

شبّی بے قرار تھا کہ جلد سے جلد گاؤں پہنچے اور وہاں موجود اپنی نانی، ماں بہنوں اور گاؤں کے لوگوں کو بھی یہ خوش خبری سنائے۔!

چنانچہ اس نے اپنے ابّا سے اجازت لی، راحیل کو ساتھ لیا اور ان دو چار ساتھیوں کو بھی —— جنھوں نے اس آلۂ خاص کو آخری مرحلے تک پہنچانے میں راحیل اور شبّی کی مدد کی تھی، اور کمال چاچا کی پیاری بٹیا جو شبّی کی ہم عمر تھی، اسے بھی ساتھ لے لیا۔ اور پھر شبّی اپنی نانی کے خوبصورت گاؤں جا پہنچا۔

اِدھر بچّوں کو لیے ہوئے بَس گاؤں کی طرف دوڑی چلی جا رہی تھی۔

مِنٹو اور آئِلو

منٹو سات سال کا ایک بہت پیارا بچہ تھا۔ اس کی ممی نہیں تھیں۔
اور وہ اپنے رشتے کی ایک پھوپی بُوا ایمو، کے پاس رہتا تھا۔
کیونکہ اگر منٹو کے پاپا خود گھر پر رہ کر اس کی دیکھ بھال کرتے تو باہر کا
کام کون کرتا۔؟
اس کے پاپا کا کام ایسا تھا کہ ہر دوسرے چوتھے دن انھیں دورے پر
جانا ہوتا تھا۔
اور منٹو کی خاطر تاکہ اس کی اچھی دیکھ بھال اور پرورش ہو سکے اس کے
پاپا تقریباً اپنی پوری کمائی 'بُوا ایمو' کے ہاتھ پر رکھ دیتے۔ مگر منٹو کے پاپا کا
یہ اقدام منٹو کے حق میں بُرا ہی ہوا۔ کیونکہ زیادہ پیسے دیکھ کر بوا ایمو، لالچی بن
گئی تھیں ان کے خود اپنے دو بیٹے تھے۔ اور دو بیٹیاں بھی تھیں۔
بیٹے دونوں نالائق تھے۔ اور انھیں اپنی بیٹیوں کے لیے جہیز بھی جمع
کرنا تھا۔ منٹو کے پاپا کی ساری کمائی وہ اپنی بیٹیوں کے لیے نئے نئے کپڑے
بنوانے اور زیور بنوانے میں خرچ کر دیتیں۔ اور منٹو کو کھانے کے لیے دُودھ

نہیں صرف روٹی ملتی۔ اس کے علاوہ اتنی چھوٹی سی عمر میں اسے بہت کام کرنا پڑتا تھا۔ منٹو، بُوا کی بکریاں چراتا، گھاس لاتا، جلانے کی لکڑیاں بٹورتا، گیہوں پسوا کر آٹا نبوانا بھی اسی کے ذمّے تھا۔

ایسے ہی کاموں میں الجھے رہنے کے باعث وہ کبھی کبھی اپنا ہوم ورک بھی نہیں کر پاتا تھا اور اسے اسکول میں اپنے ٹیچر سے ڈانٹ سُننی پڑتی تھی۔ پاپا کو بھی منٹو پر دھیان دینے کا موقع نہ ملتا تھا، اس لیے کہ انھیں بہت کام رہتا تھا۔ انھیں منٹو کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا پتہ بھی نہ چلتا تھا۔ وہ تو یہی سمجھتے رہے کہ ان کی بہن ایمو، ان کے بیٹے کو بہت اچھی طرح کھلا پلا رہی ہے۔

ایک دن کی بات ہے، منٹو اسکول سے لوٹنے کے بعد اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھیلنے نکل گیا۔ اس وقت شام ہونے والی تھی۔ اور ڈوبتے سورج کی روشنی میں آس پاس کے پیڑ پودے بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔ رنگ برنگی چڑیاں چہک رہی تھیں۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ اس خوب صورت ماحول میں بچّوں کا دل چاہا کہ وہ کچھ دیر اور کھیلیں۔ اور وہ سب کھیلنے لگے۔ ان بچّوں میں منٹو بھی تھا۔ اچانک آسمان پر بادل گھر آئے۔ اور ٹپ ٹپ بوندیں ٹپکنے لگیں۔ بچّے بارش سے بچنے کے لیے اِدھر اُدھر جگہ ڈھونڈنے لگے۔

اچانک منٹو کو یاد آیا کہ اسے گیہوں پسوانے ہیں، گیہوں نہ پسے تو...

یہ خیال آتے ہی وہ پریشان ہوگیا۔" اگر بارش دیر تک ہوتی رہی تو۔ ؟"

" میں اب گھر جاؤں گا۔" منٹو نے اپنے ساتھیوں سے کہا:

" بارش رُک جائے۔ پھر ہم سب ایک ساتھ چلیں گے۔" پپّو بولا۔

" لیکن مجھے تو گیہوں پسوانے ہیں۔" منٹو نے کہا:

" ارے، ایسا بھی کیا؟ بھیگ کر بیمار پڑ جاؤ گے۔" رنکی نے بھی ٹوکا:

" بوا مجھے ڈانٹے گی، میں پہلے ہی نہ آیا ہوتا تو ٹھیک رہتا۔" منٹو بولا:

" کیسی باتیں کرتے ہو منٹو، کیا تمھیں تھوڑی دیر کھیلنے کا بھی حق نہیں۔؟"

" اور وہ دونوں کیا کرتے رہتے ہیں۔ تمھارے بھائی۔؟ پپّو بولا:

" دن بھر آوارہ گردی، رات کو دودھ ملائی۔" منٹو کے ساتھیوں نے چڑھ کر کہا۔

" بُوا تو ان کی ممّی ہیں نا۔ اگر میری بھی ممّی ہوتیں تو مجھے بھی اتنا ہی پیار کرتیں۔ جتنا ان لوگوں کو کرتی ہیں۔" منٹو روہانسا ہوگیا:

" ارے منٹو تو رُونے لگا۔ اس کے ساتھی گھبرا گئے" —— ہم نے یوں ہی کہا تھا۔ دراصل ہمیں ان پر بڑا غصّہ آتا ہے۔" اس کے ساتھی بولے:

" غصّہ تو مجھے بھی آتا ہے۔ مگر کیا کروں ان سے چھوٹا جو ہوں۔" منٹو بولا:

اور پھر منٹو نے اپنے آنسو پونچھے پھر دوستوں سے رخصت لے کر اسی بارش میں گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر تک پہنچتے پہنچتے وہ بُری طرح بھیگ چکا تھا۔ اور دروازے

پر بُوا ایمو، غصّے میں بھری ہوئی کھڑی تھیں۔

——— ٭٭٭ ———

اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے۔ منٹو بہت اُداس تھا، آج اس کی آنکھوں سے نیند بہت دور چلی گئی تھی۔ اسے رہ رہ کر شام کی بات یاد آرہی تھی۔ کیسے بوا ایمو نے بھیگے کپڑوں سمیت اسے دو گھنٹے تک باہر کھڑا رکھا تھا۔ اتنی دیر تک بھیگے رہنے کے باعث اس ننھی ننھی ٹانگیں دُکھنے لگی تھیں۔ اسے لگاتار چھینکیں آرہی تھیں۔ اور آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی۔

اگر اس کی ممّی ہوتیں تو.... منٹو نے دیکھا تھا کہ بوا کے بیٹوں پر اگر ذرا سا پانی کی چھینٹ بھی پڑ جاتی تو بوا اس کے کپڑے فوراً بدلوا دیتیں۔ اور گرم تیل کی مالش کیا کرتیں..... جبکہ وہ جان بوجھ کر اپنی شرارتوں سے کپڑے بھگو لیتے تھے: لیکن منٹو....؟ اس کی کیا غلطی تھی بھلا؟ وہ تو بُوا کے ہی کام کا خیال کر کے برستے پانی میں دوڑا چلا آیا تھا۔ گیہوں نہ پستا تو آٹا کہاں سے آتا؟ اور آٹے کے بغیر روٹی کہاں سے بنتی؟؟

روٹی نہ پکتی تو دونوں بہنیں مُنہ پُھلا کر بیٹھ جاتیں۔ اور بھائی نہ جانے کتنی پلیٹیں توڑ ڈالتے۔ ان کا تو کچھ نہ بگڑتا، آفت آتی منٹو پر۔

منٹو کی آنکھوں میں تیز جلن ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا۔ کیوں نہ باہر جا کر چاندنی کو دیکھوں، سُنا ہے چاند کی چاندنی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔"

یہ سوچ کر اس نے کمرے کی کھڑکی کھول دی جو باغ میں کھلتی تھی۔ آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا۔ اس کی چاندنی نے بیلے، چمبیلی، اور جوہی کے پھولوں پر اپنی روشنی بکھیر کر انھیں اور بھی خوب صورت بنا دیا تھا۔ فضا میں طرح طرح کے پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ کھڑکی کھلتے ہی خوشبوؤں کا سیلاب کمرے میں گھس آیا۔

منٹو کو یہ سب بہت اچھا لگا۔ وہ اپنی تکلیف بھول کر ان نظّاروں میں کھو گیا۔

تب اس کی نظر پچھی کونے کی طرف ٹک گئی۔ جہاں سے ایک روشنی کا دائرہ گول گول گھومتا ہوا دھیرے دھیرے نیچے کی طرف اتر رہا تھا۔ اس کے ٹھیک اُوپر آسمان پر تاروں کا ایک جھنڈ تھا۔ اور ستاروں سے لے کر اس دائرے تک ریشم کے لچھوں کی طرح روشنی کی ان گنت لکیریں جڑی ہوئی تھیں۔ اب وہ چیز کچھ اور نیچے آگئی تھی۔ اور دھیرے دھیرے باغ کی دیوار کے باہر اُبھری ہوئی ایک ٹیلے پر اتر رہی تھی۔ منٹو نے دیکھا۔ وہ تھالی جیسی کوئی چیز تھی۔ جیسے ایک پلیٹ میں کچھ رکھ کر اسے اسی کے برابر کی دوسری پلیٹ سے ڈھک دیا جائے تو لگتی ہے۔ اور اس کے چاروں طرف روشنی کے دائرے پھیلے ہوئے تھے۔ اور بڑی تیزی سے گھوم رہے تھے اور ہلکی ہلکی گھرر گھرر کی آواز پیدا کر رہے تھے۔

منٹو کا دل اس عجیب چیز کو قریب سے دیکھنے کے لیے مچل اٹھا۔ اور وہ کھڑکی

سے اپنے باغ میں کود گیا۔ اور اس ٹیلے کی طرف دوڑنے لگا۔

یہ ٹیلہ اس باغ کے آخری سرے پر تھا۔ اس کے آس پاس کی زمین بنجر تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ" وہاں بھوت آتے ہیں" اس لیے وہاں گھاس بھی نہیں اُگتی۔ بھوتوں کے ڈر سے کوئی اس طرف نہیں جاتا تھا۔ وہ ٹیلہ زمین سے کوئی سو فٹ اونچا تھا۔ اس کے پیچھے کیا ہے یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ کیونکہ اس طرف کبھی کوئی گیا ہی نہیں تھا۔

وہ گول گول اُلٹی تھالی اب ٹیلے کی چوٹی پر آکر رُک گئی تھی۔ اس کے اندر سے ہلکی ہلکی گھرگھراہٹ کی آواز آرہی تھی۔

اچانک کھٹ ... کی آواز ہوئی اور اس کے اوپر والی الٹی تھالی سیپ کی طرح کھل گئی۔ اور پھر اس کے اندر سے ایک سایہ باہر آیا اور ہوا میں تیرنے لگا۔ اور پھر منٹو نے دیکھا وہ سایہ ٹیلے کے اُس پار اتر رہا ہے۔ جیسے ہوائی جہاز اترتا ہے۔

منٹو اب تک وہاں پہنچ چکا تھا۔ لیکن ٹیلے کے قریب والی زمین پر پیر رکھتے ہی اس کے منہ سے سی ـــــ کی آواز نکل پڑی۔ وہ زمین بہت گرم تھی۔

سی .... کی آواز سنتے ہی اُس پار اترنے کی کوشش کرتا ہوا سایہ رُک گیا اور تیزی سے پیچھے پلٹ گیا۔

ایک چھوٹا سا بچہ اپنی گول گول حیران آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ک کون ۔۔۔۔ ہو تم؟" سائے کی آواز باریک اور پیاری تھی۔ منٹو کو یہ آواز بڑی اچھی لگی۔

"میں منٹو ہوں"، وہ جلدی سے آگے بڑھ کر بولا۔

"مگر تم کون ہو۔؟" منٹو ذرا سا رک کر دوبارہ بولا۔

"میں ۔۔۔ میں آئلو، ہوں" وہ بولی۔

"آلو ۔۔۔۔ ؟ منٹو کھلکھلا کر ہنس دیا۔ یہ تو ایک سبزی کا نام ہے مجھے اس کی ترکاری بہت اچھی لگتی ہے۔ مگر بُوا ایمُو تو مجھے کرم کلّے کا شوربہ اور سوکھی ڈبل روٹی ہی دیتی ہے کھانے کو۔ کہتی ہے "اس سے بدن میں طاقت پیدا ہوتی ہے۔"

"میں وہ آلو نہیں ہوں۔ بلکہ آئلو، ہوں۔ آئلو ۔۔۔ یہ ایک ستارے کا نام ہے۔ یہ نام میری ماں نے رکھا تھا۔ دراصل جب میں بہت چھوٹی تھی تو میری ماں جب بھی مجھ سے کہتی "آئی لَو یُو" تو جواب میں مَیں بھی اس کی بات دوہرا دیتی تھی۔ مگر میری تُتلی زبان سے آئلو، ہی نکلتا تھا۔ تب میری ماں نے میرا یہی نام رکھ دیا۔"

"تمھاری مّاں تم سے بہت پیار کرتی ہے نا۔؟"

"کرتی تھی۔ اب تو برسوں ہو گئے اسے دیکھے ہوئے۔ میں تو بالکل اکیلی ہوں۔ میرا کوئی نہیں ہے۔ بہت پہلے جب لوگوں نے بتایا کہ میری ماں مر گئی ہے اور اب کبھی مجھے نہیں ملے گی" تو روتے روتے میں ایک جنگل کی طرف چلی آئی تھی۔

اور وہاں سے مجھے دوسرے گروہ والے اُٹھالے گئے۔ تب سے میں وہیں رہتی ہوں۔ اور ہر روز رات کے بارہ بجے گرم چشمے میں کھِلنے والا پھول لینے کے لیے میرا باس مجھے یہاں بھیجتا ہے۔"

"اوہ ۔۔۔۔ میں تو بھول ہی گئی پھول کھلنے کا وقت ہو گیا ہے اب مجھے جانا ہو گا ورنہ میرا باس مجھے کڑی سزا دے گا۔"

"کہاں جاؤ گی تم ۔۔۔۔؟"

"اسی ٹیلے کے پیچھے۔ کیا تمھیں اپنے آس پاس کی زمین گرم نہیں معلوم ہوتی۔؟"

"بہت گرم ہے اسی پر تو میرا پیر پڑا تو پیر جلنے سے میرے منہ سے سی ۔۔۔ کی آواز نکل گئی اور تم میرے پاس چلی آئیں۔"

"تمھارے پیروں میں آبلے تو نہیں پڑے ۔۔۔۔؟" وہ گھبرا کر بولی ۔۔۔

"نہیں ۔۔۔۔ کیونکہ میں نے جلدی سے پیر ہٹا لیا تھا اور میرے پیروں میں موزے بھی ہیں ۔۔۔ یہ موزے میرے پاپا لائے تھے۔"

"تم بہت پیارے بچّے ہو۔ میرا جی چاہتا ہے تم سے خوب باتیں کروں۔ برسوں بعد کسی آدمی سے بات کرنے کا موقع ملا ہے۔"

"کیا تمھارے یہاں آدمی نہیں رہتے۔؟"

"نہیں، وہ سب کے سب مشینی آدمی ہیں۔ جن سے کام کرانے کو صرف

بٹن دبانا ہوتا ہے۔ ان سے بات نہیں کی جا سکتی۔ اگر بات بھی کرو تو وہ اس سے
زیادہ نہیں بول سکتے جتنا ان کے دماغ میں بھر دیا گیا ہو۔ مشینی آدمی صرف مشینی
بولی بولتے ہیں۔ نہ وہ ہنس سکتے ہیں نہ رو سکتے ہیں۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔
بہت دیر ہو چکی ہے۔"

"کیا تم مجھے بھی اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتیں۔؟ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ
وہ گرم چشمہ کہاں ہے اور اس کے اندر کھلنے والا پھول کیسا ہے۔؟"

"جی تو میرا ابھی چاہ رہا ہے کہ تم میرے ساتھ چلو ہم راستے بھر باتیں کرتے
چلیں گے۔ پھر واپسی میں تمھیں یہاں چھوڑ کر اپنے سیّارے پر لوٹ جاؤں گی۔ مگر
مشکل یہ ہے کہ یہ بات کسی کو معلوم نہیں ہونی چاہیئے کہ دوسرے سیّارے والے یہاں
پھول چُرانے آتے ہیں۔ ورنہ میرا باس ـ ـ ـ ـ"

"میں کسی سے نہیں کہوں گا وعدہ کرتا ہوں۔" منٹو نے کہا۔

"تمھارے گھر والے تمھیں ڈھونڈھیں گے نہیں۔؟"

"کون ہے رات کو ڈھونڈھنے والا۔ پاپا تو اپنے کام سے باہر باہر ہی رہتے
ہیں۔ رہی بُوا ایمو، تو وہ جبھی ڈھونڈھیں گی جب انھیں کوئی کام کرانا ہوگا۔"

"تو آؤ میری پیٹھ پر بیٹھ جاؤ۔"

"میں تمھیں بھاری نہیں لگوں گا۔؟"

"تم اتنے ننّھے سے بچّے، بھاری کیسے لگنے لگے۔" اور وہ نیچے جُھک گئی۔

"منٹو اس کی پیٹھ پر بیٹھ گیا۔ اور اسے لے کر اڑنے لگی۔
منٹو کو لگا جیسے بادل اس کی مٹھی میں آ گئے ہیں۔
"تم اڑ کیسے سکتی ہو۔؟ کتنا مزہ آ رہا ہے واہ ـــــ منٹو نے خوشی سے کہا۔
"اڑنے کا یہ فن مجھے میرے دادا نے سکھایا تھا۔ اسی کی وجہ سے "تمبل"
نے مجھے اپنے سیارے پر کھینچ لیا۔ کیونکہ گرم چشمہ پار کرنا کسی کے بس کی بات نہیں
ہے۔ میں تو اڑ کر سیدھی اسی درخت کی ڈال پر پہنچ جاتی ہوں اور اس کے اوپر
کھلنے والا پھول توڑ لیتی ہوں۔"
"مجھے بھی وہیں اتار دو گی۔؟"

"نہیں.... تم اتر نا مت۔ میری پیٹھ پر ہی بیٹھے رہنا۔ کیونکہ چشمے کا پانی
ہر وقت کھولتا رہتا ہے۔ اور اس سے گرم بھاپ کے غبار اٹھتے ہیں۔" اور چشمے کا
پانی کھولتا رہتا ہے۔ تم اسی طرح میری پیٹھ پر بیٹھے رہنا۔"
"لیکن تمھارے باس نے مشینی آدمیوں کی فوج کس لیے تیار کی ہے۔؟"
"اس لیے کہ اسے گوشت اور پوست والے آدمیوں سے نفرت ہو گئی ہے
اور وہ اپنی مشینی فوج کے ذریعے سے پوری دنیا تباہ کر ڈالنا چاہتا ہے۔ اور یہ
پھول ان ہی آدمیوں کا دماغ تیار کرنے میں کام آتا ہے۔"
"لیکن اسے آدمیوں سے نفرت کیوں ہے۔؟ کیا وہ بھی مشینی آدمی ہے۔؟"
"نہیں وہ مشینی آدمی نہیں ہے۔ اس کے دل کا پیار مر گیا ہے۔ کیونکہ بہت

سال پہلے کچھ ظالم آدمیوں نے اس کے پورے خاندان کو تباہ کرڈالا تھا۔ اور وہ ایک درخت کے پیچھے چھپا اپنے خاندان کی بربادی کا تماشا دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس وقت وہ بہت چھوٹا سا تھا۔ جب سب کچھ ختم ہوگیا تو وہ اپنے خاندانی شان وشوکت کی آخری نشانی "ہریالی کا شنکھ" اپنے سینے سے لگائے ایک ٹیلے پر جا بیٹھا تاکہ اسے دُور دُور تک کسی آدمی کی صورت دکھائی نہ دے۔ کیونکہ اس کے دل کا پیار مر گیا تھا۔ کئی دن اور کئی راتیں بیت گئیں۔ وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ اوپر آسمان کو تکتا رہا......

اچانک ایک دن تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ پھر بادل گھر آئے۔ اور بارش ہونے لگی ایسی بارش ہوئی ایسی بارش ہوئی کہ تمام جل تھل ہوگیا۔ بڑے بڑے درخت ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔ وہ بچہ طوفان سے بچنے کی خاطر اندر جنگل کی طرف دوڑنے لگا۔ اندر بہت دُور جانے پر اسے ایک بڑا سا گڈھا دکھائی دیا۔۔اس کے چاروں طرف گھنی گھنی جنگلی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ اس لیے پانی اس کے کنارے سے ڈھلوان کی طرف بہہ رہا تھا۔ گڈھے میں پانی نہیں بھرا تھا۔

اس گڈھے میں بہت نیچے اسے ایک چمکتی ہوئی چیز نظر آرہی تھی۔ وہ ہمت کرکے کنارے کنارے نکلے ہوئے پتھروں کے سہارے اندر کی طرف اترنے لگا....

جب وہ ایک دم نیچے پہنچ گیا تو اس نے دیکھا کہ وہ انڈے کی شکل کی بڑی سی کوئی چیز تھی۔ اس کے اوپری سرے پر کھڑکی جیسی بنی ہوئی تھی۔ اس کا پلہ کھلا ہوا تھا۔

اور اُس انڈے نما چیز کے آس پاس نارنگی رنگ کے دھاتوں کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ یہ ٹکڑے عجیب عجیب شکلوں کے تھے، جیسے تین تین انگلیوں والے ہاتھ پیر ہوں۔ لمبائی میں کاٹے گئے اُبلے انڈوں کے آدھے ٹکڑے کی طرح ایک کھوپڑی نما چیز بھی وہاں پڑی تھی۔ جس کے اوپر دو لمبی لمبی آنکھوں کے سے نشان بنے ہوئے تھے۔ جن کے اندر چھوٹے چھوٹے نیلے نیلے بلب جیسی پُتلیاں تھیں، جو بجھی ہوئی تھیں۔ یعنی ان میں روشنی نہیں تھی۔ وہ بُجھے ہوئے بلب کے شیشے جیسی تھیں۔۔۔۔ اور اس کھوپڑی کے اندر اَن گنت تاروں کے گچھے پروئے ہوئے تھے۔۔۔۔ اور اس کے بیچوں بیچ کٹوری نما ایک چیز لگی ہوئی تھی جس کے اندر لال رنگ کا 'سیّال' جما ہوا تھا۔

شاید یہ کسی مشینی آدمی کے جسم کے ٹکڑے تھے۔ جو اپنے مقام سے نکل کر دوسرے سیّارے میں آیا ہوگا۔

اس نے ان تمام چیزوں کو حیرت سے دیکھا۔۔۔۔ اور مزید کچھ جاننے کی خواہش اس کے اندر پیدا ہوگئی۔ پہلے وہ تھوڑا سا جھجکا کچھ ڈرا۔۔۔۔ اور پھر ہمت کر کے اس کھڑکی کے اندر گھس گیا۔۔۔۔

اور پھر اچانک وہ کھڑکی بند ہوگئی۔ پھر ایک دم اندھیرا ہوگیا۔ ڈر کے مارے اس بچّے کی حالت بُری ہونے لگی۔ پھر یہ سوچ کر کہ اگر وہ مر بھی گیا تو کیا فرق پڑ جائے گا۔؟ کون ہے جو اسے ڈھونڈنے نکلے گا۔۔۔ وہ ایک کونے میں سمٹ

گیا .... پھر ایک ہلکی سی آواز ہوئی۔ اور سامنے ایک لال بتّی جل اٹھی۔ اس روشنی کے چاروں طرف کئی رنگ کے گول گول لچھّے تیزی سے گھومنے لگے ..... پھر وہ پورا انڈا گول دائرے کی شکل میں گھومتا ہوا اوپر اٹھنے لگا...... بچّے کو لگا کہ وہ کسی گھرنی کی نوک پر اٹک گیا ہے .... اور وہ گھرنی تیزی سے چک پھیریاں لیتی اوپر اڑتی جارہی ہے۔ کبھی اسے اتنی گرمی محسوس ہوتی کہ لگتا وہ کسی گرم توے پر بیٹھا دیا گیا ہو ... پھر اچانک ماحول بدل گیا اور اُسے ایسا لگا جیسے اس کے چاروں طرف برف ہی برف پھیل گئی ہو اور وہ برف کی سلوں پر لڑھکایا جارہا ہو۔

نہ جانے کتنی دیر تک وہ اسی طرح چک پھیریاں کھاتا رہا ــــــ پھر ایک زور کا جھٹکا لگا .... اور چکری کا گول چکّر دھیرے دھیرے کم ہونے لگا ...... اور پھر وہ رُک گئی ــــ اور ایک زور کا دھماکا .... ہوا اور کھڑکی کھل گئی ......

شاید یہ خودکار اڑن طشتری، یا خلائی جہاز رہا ہوگا .... بہت دیر بعد بچے کے حواس کچھ درست ہوئے تو وہ اس دھات کے انڈے سے باہر جھانکنے لگا ... اس کے آس پاس ہر چیز لال رنگ کی تھی۔ اور دھات کا یہ انڈا بھی ایک سیاہی مائل سرخ رنگ کے ٹیلے کی نوکیلی چوٹی پر ٹکا ہوا تھا ...... یہ ٹیلہ زمین سے کوئی ۱۵۔۲۰ فٹ کی اونچائی پر رہا ہوگا ... نیچے اترنے کے لیے

اس کے ساتھ دندانے دار پتھر لگے ہوئے تھے۔ ان پتھروں کا رنگ بھی سیاہی مائل تھا۔

وہ چھوٹا سا بچہ ایک انجانے سیارے پر پہنچ گیا تھا۔ مگر چونکہ اس کا جی اپنی زمین سے اُوب گیا تھا اس لیے وہ گھبرایا نہیں۔ اور دھیرے دھیرے ٹیلے سے نیچے اترنے لگا..... اس نے اِدھر اُدھر دیکھا.... وہاں مکان تھے مگر آدمی نہیں، درخت تھے مگر چڑیاں نہیں تھیں ـــــ جنگل تھے مگر جانور نہیں تھے۔ اور اس سیارے کے پیڑ، پودے مٹی اور پتھر سب کا رنگ لال تھا ـــ کسی جاندار کی تلاش کرتے کرتے وہ ایک جھونپڑی کے سامنے پہنچ گیا۔ جھونپڑی کے سامنے ایک بہت بوڑھی عورت لاٹھی کے سہارے کھڑی تھی، اس کے سفید بال چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے، اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر زمین پر گر رہے تھے ـــــ

بچے نے آگے بڑھ کر اس سے پوچھا......

"تم کون ہو اور کیوں رُو رہی ہو......؟

"بھاگ جا.... بھاگ جا....!" بڑھیا زور سے چلائی .....

"اس دھرتی کا رنگ لال کیوں ہے۔؟" بچے نے دوبارہ پوچھا.... وہ ڈرا نہیں تھا۔

"یہ خون ہے.... خون سے رنگی دھرتی ہے یہ، تو لوٹ جا... لوٹ جا۔

"میں لوٹ کر کہاں جاؤں گا بھلا .... اور کیسے ؟۔ مجھے تو کوئی راستہ بھی نہیں معلوم ؟"

" سب کو مار دیا .... سب کو مار دیا .... اس نے مار دیا سب کو .... !"

بڑھیا .... بڑبڑاتی ہوئی جھونپڑی کے اندر گھس گئی .... اور پھر وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے جھونپڑی میں گھس گیا .... اس نے دیکھا وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے اور اپنے بال نوچ رہی ہے —— اور سامنے ہی بڑے سے طاق پر ایک موٹی سی کتاب پڑی ہوئی ہے اور اس کے اوراق زور زور سے پھڑ پھڑا رہے ہیں .....

"کس نے کس کو مار دیا ؟" بچّے نے ایک بار پھر بڑھیا سے پوچھا .....

" میرے بیٹے نے مارا .... اس کتاب نے مارا .... وہ .... وہ ساتوں سیّاروں کا راجہ بننا چاہتا تھا وہ ..... اس نے اپنے بھائی کو مار ڈالا .... اور اس کو خود اس کی بنائی مشین نے مار ڈالا ..... اور جب وہ نیچے گرا تو زمین پھٹ گئی .... کیونکہ اس کے نیچے دنیا کو تباہ کرنے والے مسالے رکھے ہوئے تھے .... سب کو نگل گئی .... سب کو .... !"

بُڑھیا پھر زور زور سے رونے لگی ..... بہت دیر تک روتی رہی اور پھر چُپ ہو گئی۔ جھونپڑی میں گہرا سنّاٹا پھیل گیا ——

بہت دیر تک کوئی آواز نہیں سنائی دی .... اور جب سنّاٹا اس بچّے

سے سہا نہ گیا تو اس نے ہمّت کر کے بُڑھیا کو چُھوا، اور پھر چونک کر پیچھے ہٹ گیا۔ بڑھیا ایک طرف کو لڑھک گئی تھی .... اور دیوار پر لگا گھنٹہ ایک صدی کے گذر جانے کا اعلان کر رہا تھا۔"

آئلو، اب چُپ ہوگئی تھی۔ اور دھیرے دھیرے ہوا میں تیرتی ہوئی نیچے کی طرف اُترنے لگی تھی۔ مِنٹو اسی طرح اس کی پیٹھ سے چپکا ہوا تھا... پھر اسے وہ گرم چشمہ نظر آنے لگا۔ دور تک گرم ہواؤں کی حدّت محسوس ہو رہی تھی۔ چشمے کا پانی کھول رہا تھا۔ بھاپ اٹھ رہی تھی .... چشمے کے بالکل بیچ میں نیلی پتیوں اور کالے تنوں والا وہ درخت تھا، اور اس کے بالکل بیچ والی شاخ میں وہ پھول کھلا ہوا تھا، اور اس سے آگ کی لپٹوں جیسی روشنی نکل رہی تھی۔

آئلو اس درخت کی سب سے اونچی ڈالی پر اتر گئی، یہاں بہت گرمی تھی مِنٹو پسینے میں شرابور ہو گیا۔

آئلو نے جُھک کر وہ پھُول توڑ لیا.... اور جلدی سے اوپر اُڑ گئی اُڑتے اُڑتے اس نے پھُول کو اپنی ٹوپی میں چھپا لیا تھا۔

جب وہ تھوڑا اوپر اُٹھ گئی اور گرم ہوا ہلکی محسوس ہونے لگی تو منٹو نے اس سے پوچھا.....

"پھر کیا ہوا؟"

"کیا.... کیا ہوا؟" آئلو نے منٹو سے پوچھا۔

"وہ شنکھ والا لڑکا وہاں سے لوٹ آیا؟" منٹو نے آئلو سے پوچھا........

"نہیں.... وہ لوٹا نہیں، بلکہ وہیں اسی جھونپڑی میں بیٹھ کر اس کتاب کو پڑھنے لگا..... پڑھتا رہا، پڑھتا رہا، بنا سوئے، بنا کھائے، اور اسی طرح کئی برس بیت گئے۔ اس کی لمبی لمبی داڑھی اور گھنی گھنی مونچھیں اُگ آئیں، سَر کے بال سفید ہو گئے۔ اور جب وہ پوری کتاب ختم ہو گئی تو تب تک وہ بُرا اور بھیانک آدمی بن گیا تھا——"

" اس کتاب میں کیا لکھا تھا؟" منٹو نے پوچھا——

" اس میں مشینی آدمی اور طرح طرح کے مسالے تیّار کرنے کی ترکیبیں لکھی ہوئی تھیں۔ اور اس لڑکے کے دل میں پہلے ہی نفرت کا جو بیج پڑ گیا تھا، اب وہ پودا بڑھ کر تناور درخت بن گیا تھا—— لہٰذا اس نے کتاب میں لکھی ساری ترکیبوں کو بُرائی کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا—— اور ان کی مدد سے بہت سارے ہتھیار بنا ڈالے، ساتھ ہی ان ہتھیاروں کو استعمال کرنے کے لیئے بہت سے مشینی آدمی بھی بنا لیے۔ مگر ان کا دماغ تیار کرنے کے لیے گرم چشمے میں کھلنے والا آگ کا پھول چاہیئے تھا۔ اور یہ پھول تب ہی وہاں لے جایا جا سکتا تھا جب اس کے پاس اڑنے کا فن جاننے والا آدمی ہوتا۔ ایک دن اپنے گرہ سے نیچے کا معائنہ کرتے کرتے اس نے مجھے دیکھ لیا.....

اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے، میں اپنے اکیلے پن سے گھبرا کر اپنے
باغیچے میں گھوم رہی تھی، اُس سیارے کی ریز کرنیں میرے باغ کے تالاب
میں سیدھی پڑ رہی تھیں، میں اپنے تالاب کے کنارے بیٹھی پانی میں تیرتے
ہوئے ستاروں کے عکس دیکھ رہی تھی، کہ میرا جی چاہا اب تھوڑا اڑ کر اپنا دل
بہلاؤں، یہ سوچ کر میں نے اپنے بازو تولے اور زمین سے تھوڑا اونچا اٹھ کر
پورے تالاب کے چاروں طرف ایک چکّر لگا کر نیچے اترنے ہی والی تھی کہ
اچانک ایک گھڑ گھڑاہٹ کی آواز ہوئی .... اور وہ کرنیں میری طرف گھوم
گئیں .... اور ایک دم سے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا.... اور میں اوپر کی
طرف کھنچی جانے لگی۔ ڈر کے مارے میری آواز رُک گئی میں چیخ بھی نہ سکی۔
میری آنکھیں بند ہو گئیں .... اور اسی طرح جھولتی جھلاتی میں اُس دھرتی پر
جا گری .... دو لال لال آنکھوں نے مجھے گھُور کر دیکھا۔ اور ایک بھاری آواز
آئی جیسے کوئی ڈرم لڑھک رہا ہو.....

"تمھیں یہاں اس لیے لایا گیا ہے کہ تم اُڑنے کی 'کلا' جانتی ہو.... اور
مجھے تمھاری دھرتی پر گرم چشمے میں کھِلنے والا پھُول چاہیئے. کوئی اڑنے والا
آدمی ہی اسے توڑ سکتا ہے۔ یہ پھول ہر رات کو آدھی رات کے بعد کھِلتا ہے،
اور بھور ہوتے ہوتے گرم چشمے میں گر جاتا ہے۔ اس لیے تمھیں ہر رات یہ پھول
لانے جانا ہوگا اور بھور ہونے سے پہلے لوٹ آنا ہوگا.... بھاگنے کی کوشش بیکار

ہوگی، کیونکہ ہماری طاقتیں تمھیں ہمیشہ اپنے دائرے میں لیے رہیں گی.....“

اچانک ایک جھٹکا لگا.... اور آئلو چونک اُٹھی..... باتوں باتوں میں اسے دھیان ہی نہ رہا کہ اُسے منٹو کو اس کے گھر پہنچانا تھا.... اب وہ بہت پریشان لگنے لگی تھی ... اب یہاں سے لوٹ کر جانا ممکن ہی نہیں تھا۔

کیا مجھے تمھارے ساتھ دیکھ کر وہ تمھیں سزا دے گا؟“ اچانک منٹو نے پوچھا۔

”نہیں وہ سزا تو نہیں دے گا۔ لیکن تم اُسے دیکھ کر ضرور ڈر جاؤ گے ۔“ آئلو بولی۔

”پھر.....؟“

”پھر یہ کہ تمھیں ہمت سے کام لینا ہوگا، کیونکہ اس کا چہرہ بہت بھیانک ہے، وہ صدیوں سے نہیں سویا۔ اس لیے اس کی آنکھیں باہر کی طرف اُبل آئی ہیں، داڑھی بہت لمبی، اور مونچھیں بہت موٹی ہیں، چہرہ بھیانک اور کالا ہے۔ مونچھوں کی وجہ سے اس کے ہونٹ بھی دکھائی نہیں دیتے، اور جب وہ بولتا ہے تو اس کی آواز کسی گہرے غار سے آتی محسوس ہوتی ہے ۔“

”وہ سوتا کیوں نہیں؟“ منٹو نے پوچھا۔

کیونکہ اسے سکون نہیں ہے، اسے سلانے کی ایک ترکیب معلوم ہوئی ہے مجھے۔ وہ یہ کہ اگر تم جیسا پیارا اور چھوٹا بچہ اس سے ڈرے بغیر اس کے گال پر پیار

سے ہاتھ رکھے تو اسے نیند آجائے گی ــــ اور جب وہ سو جائے تو وہی بچّہ اس کے کمرے کے تہہ خانے کے اندر برسوں سے پڑا شنکھ، اٹھا کر پھونک دے"۔

"شنکھ پھونکنے سے کیا ہو گا۔؟"

اس کے اندر کا پیار جاگ اٹھے گا۔ وہ دنیا کی تباہی کا خیال چھوڑ دے گا اور پھر سے جوان ہو کر اچھا آدمی بن جائے گا ــــ"

منٹو یہ سب سُن کر چپ ہو گیا.... اور کچھ سوچنے لگا ــــ

آئلو اڑتی گئی.... اڑتی گئی.... اس کی ٹوپی کے اندر رکھا ہوا پھول بلب کی طرح روشنی دیتا رہا، روشنی کا ہالہ گول گول گھومتا ہوا، اوپر اور اوپر کھینچتا رہا ــــ

اوپر گہرا نیلا آسمان تھا۔ اور اس کے چاروں طرف رنگ برنگے گولے ناچ رہے تھے۔ منٹو کو لگ رہا تھا آسمان ایک گول چھتری ہے، جس کی کمانیوں میں رنگین غبّارے بندھے ہوئے ہیں، اور ہوا انھیں نچا رہی ہے۔

منٹو، اور آئلو اب دانتوں جیسی نکیلی پہاڑیوں کے اوپر سے گذر رہے تھے، پورب کی طرف سے ایک بڑی سی گیند آسمان کے بالکل نچلے کونے سے کروٹیں لیتی دھیرے دھیرے اوپر اٹھ رہی تھی، اس کا رنگ کالا تھا۔

"یہ سورج ہے۔" آئلو نے کہا۔

"اور ہماری دھرتی کہاں ہے؟" منٹو نے پوچھا۔

"اس سے نیچے، بہت نیچے" آئلو نے جواب دیا۔

منٹو نے نیچے دیکھنے کی کوشش کی، اور ڈر گیا۔

"نیچے تو ایک کالا سا گولا نظر آ رہا ہے" منٹو بولا۔

"کیونکہ وہاں ابھی رات ہے۔ تھوڑی دیر بعد جب یہ گولا تھوڑا اور اوپر آ جائے گا تو وہاں روشنی ہو جائے گی، اور ایسی دکھائی دینے لگے گی جیسے زمین سے دیکھنے پر چاند نظر آتا ہے" آئلو بولی۔

"ایسا کیوں ہوتا ہے؟" منٹو نے پوچھا۔

"اس لیے کہ یہ قدرت کا قانون ہے۔ جب ایک طرف اندھیرا ہوتا ہے تو دوسری طرف اجالا ہو جاتا ہے"

"وہ کس لیے؟" منٹو نے پھر پوچھا۔

"اس لیے کہ اگر سارا عالم ایک ساتھ سو گیا تو حرکت رُک جائے گی، اور جب حرکت رک جائے گی تو تمام سیاروں کی گردش بھی ختم ہو جائے گی، اور اگر گردش رُک گئی تو پھر کوئی بھی نہیں بچے گا۔ سارے سیارے ایک جگہ آ کر اٹک جائیں گے یا اچانک ہی ایک دوسرے سے ٹکرا کر چُور چُور ہو جائیں گے۔ ایک آتا ہے تو دوسرا جاتا ہے، یہی قانون ہے قدرت کا" آئلو نے منٹو کو سمجھایا۔

"اچھا یہ تو بتاؤ۔ بڑھیا کے بیٹے نے اپنے بھائی کو کیوں مار دیا۔؟" منٹو نے پھر پوچھا۔

"اس لیے کہ وہ بہت قابل تھا، بڑا علم والا، وہ تمام سیاروں کو قابو میں کرنے کا طریقہ جانتا تھا، مگر اس کے باوجود وہ صرف اپنے سیارے پر امن وسکون کے ساتھ رہنا چاہتا تھا، کیونکہ اس کا دل بہت نرم تھا، جبکہ اس کا بھائی لالچی اور بے رحم تھا۔ اس نے بار بار اپنے بھائی کو حملے کے لیے اکسایا، مگر اس نے اس کی بات نہیں سنی اور نہ اسے دوسرے تمام سیاروں کو قبضہ میں لینے کا راز بتایا، تب اس نے اپنے بھائی کو مار ڈالا، اور اس کی کتاب چرالی۔ اور پھر اس کتاب کو پڑھ کر ایک مشینی آدمی بنا ڈالا، اور اس سے اپنا کام کرانے لگا۔ جس کی وجہ سے کام کرنے والے آدمی بیکار ہو گئے اور بھوکوں مرنے لگے۔ جب بھوک کی تکلیف بڑھ گئی، تب مزدوروں میں بغاوت کی لہر دوڑ گئی، اور تب سب نے مل کر اس کے محل کے سامنے دھرنا دیا۔

اسے بہت غصہ آیا، اور اس نے اپنے مشینی آدمی کو اُن پر حملہ کا حکم دیا اور اس کا بٹن دبا دیا.....

جلد بازی اور جنون میں بٹن الٹا دب گیا۔ اور پھر۔"

"پھر کیا ہوا؟" منٹو نے بے صبری سے پوچھا۔

"اس مشینی آدمی نے اپنے بنانے والے پر حملہ کر دیا، اور اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین پر گر گیا۔ اس کے گرتے ہی ایک زور کا دھماکہ ہوا، اور دھرتی پھٹ گئی۔"

"پھر...؟"

"پھر یہ ہوا کہ کہیں کچھ نہ بچا۔ سب ختم ہو گئے اور ان کے خون سے دھرتی، پہاڑ، پیڑ، پودے، سب لال ہو گئے۔"

"اور اس کی ماں....؟"

"ماں بچ گئی، وہ بہت نیک تھی، اور اپنے چھوٹے بیٹے کے مرنے کے بعد محل چھوڑ کر چلی گئی تھی، اور سب سے کنارے ایک جھونپڑی میں رہتی تھی۔ مگر خون بہتے بہتے اس کی جھونپڑی تک آ پہنچا تھا۔ صبح کو وہ جب جھونپڑی سے باہر نکلی تو اس نے دیکھا، آس پاس تمام خون کا رنگ پھیلا ہوا ہے۔ وہ سمجھ گئی کہ ساری جنتا اس کے بیٹے کے ظلم کا شکار ہو گئی ہے، اور وہ خود بھی نہیں بچا، بڑھیا غم سے پاگل ہو گئی، اور جب وہ شنکھ والا لڑکا وہاں پہنچا تو وہ مر گئی۔"

"کیا اس دھرتی کا رنگ اب کبھی نہیں بدلے گا؟" منٹو نے دکھی ہو کر پوچھا۔

"بدلے گا..... اگر ہریالی کا شنکھ، کوئی بجا سکے۔" آئلو نے جواب دیا۔

"میں اسے بجا سکتا ہوں۔؟"

"تم!" آئلو نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

اور اسی وقت کالے پہاڑ کی نکیلی چوٹی پر روشنی کا دائرہ ٹھہر گیا۔

آئلو نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر منٹو کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ اور دھیرے

دھیرے چلتی ہوئی باہر نکل آئی۔

منٹو نے دیکھا سامنے ایک بہت بڑا بہت پرانا لال رنگ کا مکان ہے

یہ مکان بہت اونچا تھا۔ اور اس کی بُرجیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔

آنلو نے پھر بازو تولے اور ہوا میں تیرتی ہوئی اُس مکان کی چھت پر اُتر گئی۔

چھت کے چاروں طرف اونچی اونچی لوہے کی جالی دار دیوار بنی ہوئی تھی۔ منٹو نے جالی میں آنکھ لگا کر نیچے کی طرف جھانکا، نیچے ایک بہت بڑا آنگن تھا۔ آنگن کے چاروں طرف لوہے کی دیواریں بنی ہوئی تھیں، آنگن کے بالکل بیچ میں ایک کنوئیں نما چولھا بنا ہوا تھا، اور اس پر ایک بہت بڑی کڑھائی چڑھی ہوئی تھی۔ اور اس کے اندر کوئی سیّال ابل رہا تھا، اس کے چاروں طرف مشینی آدمی کھڑے اپنے 'اسپائز' جیسے ہاتھوں سے لوہے کے بڑے بڑے ڈنڈے پکڑے اس 'سیّال' کو چلا رہے تھے۔ اور ان کے سروں کے اندر جو کٹورے کی مانند تھے، دندانے دار گول گول، چھوٹی بڑی چکریاں تیزی سے گھوم رہی تھیں۔ اور ان سے جڑے ہوئے پتلے پتلے تاروں کے، ایک سرے پر چھوٹے پلگ، جیسے دھات کے ٹکڑے، آنگن کے چاروں کونوں پر بنے، ٹیلی ویژن، ٹاور نما کھمبوں میں فِٹ کیے ہوئے تھے، اور ان کے بالکل بیچ میں کافی اونچائی پر ایک سوئچ بورڈ جھول رہا تھا۔

اور پورے آنگن میں نارنگی رنگ کی دھات کے ٹکڑے، طرح طرح کی شکلوں میں ڈھلے ہوئے، بکھرے پڑے تھے۔

"اس کڑھائی میں کیا ہے؟" منٹو نے آنلو سے پوچھا۔

"اسی پھول کا عرق ہے یہ، ابھی جو پھول آیا ہے وہ بھی اسی میں ڈال دیا جائے گا۔ آنلو نے بھی اشارے سے جواب دیا، جس طرح منٹو نے اشارے سے پوچھا تھا۔

"اور وہ چاروں؟" منٹو نے پھر پوچھا۔

"طاقت کے مینار، ان میناروں پر سے کہیں بھی دیکھا جا سکتا ہے، اور دنیا کے کسی بھی حصّے پر حملہ کیا جا سکتا ہے۔" آنلو نے پھر اشارے سے جواب دیا۔

"اور یہ تار؟ اور بیچ میں جھولتا ہوا سوئچ بورڈ۔؟" منٹو نے پھر پوچھا۔

"ان مشینی آدمیوں کو یہ تار ہی چلاتے ہیں اور سوئچ بورڈ کے اندر انھیں چالو اور بند کرنے کا آلہ لگا ہوا ہے۔ آنلو نے سمجھایا۔

چھت سے نیچے اترنے والی سیڑھیاں پیچ دار تھیں۔ اترتے اترتے منٹو کے پاؤں تھک گئے۔ پھر انھوں نے ایک بڑا سا برآمدہ طے کیا۔ اور ایک بہت بڑے کمرے کے دروازے تک پہنچے۔

کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ منٹو نے جھانکا، کمرے کے بالکل

بیچ ایک بڑا سا پشتہ بنا ہوا تھا، اس پشتے کے کنارے ایک کرسی پر ایک بہت ہی بھیانک آدمی، ایک بہت موٹی کتاب کھولے بیٹھا ہوا تھا۔ کتاب کی اونچائی منٹو کے قد کے برابر تھی۔ وہ آئلو کے پیچھے چھپتا چھپتا چل رہا تھا۔ آئلو اب اُس آدمی کے پاس پہنچ گئی تھی۔ منٹو دھیرے سے سرک کر پشتے کے پیچھے آ گیا۔

آئلو کی آہٹ پا کر اُس آدمی نے جو سامنے کی طرف دیکھا، تو منٹو کو لگا جیسے اس کے سامنے کوئی بھیانک ریچھ بیٹھا ہوا ہے۔ اور اس کی آنکھوں کی جگہ انگارے رکھے ہوئے ہوں، اتنی بڑی اور باہر کو نکلی ہوئی آنکھیں اس نے کسی تھری، ڈی کامکس میں بھی نہیں دیکھی تھیں۔

آئلو نے کتاب کے بیچ میں وہ پھول رکھ دیا اور الٹے پیروں پیچھے کھسکنے لگی۔

اچانک اسے جھٹکا لگا، وہ پلٹ کر دیکھنا ہی چاہتی تھی، تب تک منٹو دھڑام سے کتاب پر کود گیا تھا، اور اس بھیانک آدمی کے گال چھو لئے تھے۔

آئلو ڈر کے مارے کانپ رہی تھی۔ اس کی نگاہیں ایک ٹک اس آدمی کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں، اس نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں بند ہونے کی جھپکی لے رہی ہیں، پھر وہ آنکھیں چھوٹی ہوتے ہوتے اپنی جگہ پر

جا کر ٹھہر گئیں، اور ان پر پلکوں کا سایہ چھا گیا۔ اور پھر وہ اُسی جگہ لڑھک کر سو گیا۔

آملو جو اب تک ڈری سہمی کھڑی تھی، اسے سوتے دیکھ کر اتنی خوش ہوئی کہ زور زور سے تالیاں بجانے لگی۔ تمبل پوری طرح سو چکا تھا۔ آملو نے غور سے اسے دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر کھلی ہوئی کتاب بند کر دی۔ اور تمبل کا پیر سیدھا کر کے اسے چادر اوڑھا کر، منٹو کو سینے سے چمٹا لیا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ پھر اس نے منٹو کی پیشانی چوم لی۔ اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر گر کر منٹو کے بال بھگونے لگے۔

اچانک منٹو کو کچھ یاد آ گیا، اور وہ آملو کی گود سے نکل کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا، اور بولا:

"مجھے اوپر لے چلو۔"

"اوپر کہاں.....؟" آملو نے پوچھا:

"وہاں، آنگن کے مینار پر۔" منٹو نے کہا:

"مگر وہاں خطرہ ہے۔ مشینی آدمی اگر تم پر حملہ کر بیٹھے تو؟"

"تم نہیں لے جاؤ گی تو میں خود وہاں چلا جاؤں گا، اور اگر گر پڑا تو تم سمجھنا۔" منٹو نے دھمکی دی:

آئلوگم صُم ہوکر کچھ سوچنے لگی، پھر بولی:

"اچھا چلو، لے چلتی ہوں، مگر تم وہاں جاکر کیا کرو گے بھلا؟"

"تم لے تو چلو، ورنہ میں جا رہا ہوں، تمہیں تو اس لیے کہا کہ تم اُڑ سکتی ہو، اپنی پیٹھ پر بیٹھا کر زمین سے اس سیّارے تک آسکتی ہو تو اس مینار کے اوپر پہنچنا تمہارے لیے کیا مشکل ہے؟" منٹو نے ضد کی:

"خدا تمہاری حفاظت کرے ننھے بچّے، آؤ میری پیٹھ پر بیٹھ جاؤ۔"

منٹو اس کی پیٹھ پر بیٹھ گیا۔ آئلو نے پر تولے یعنی اپنے بازو اوپر اٹھائے اور اڑنے لگی۔ لیکن گھر کے چاروں طرف باریک تاروں کی نظر نہ آنے والی جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس لیے وہ اڑنے کے بجائے چل کر سیڑھیاں طے کرنے لگی، اور چھت کے اوپر چلی آئی۔ اور وہاں سے جو اڑی تو چاروں میناروں کے بالکل بیچ میں آکر ہوا میں معلق ہوگئی۔

"اب کیا کرو گے؟" آئلو نے منٹو سے پوچھا:

"بتاتا ہوں ....." یہ کہتے کہتے وہ اچانک اس کی پیٹھ پر سے نیچے کود گیا۔ آئلو کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"اے دونوں جہانوں کے مالک، اس بچّے کو بچالے۔!"

منٹو سیدھا تاروں کے باریک جال پر جا گرا تھا، اور اس نے اپنی ننھی سی انگلی جالی کے اندر گھسا لی تھی، اور اسی کے سہارے دھیرے

دھیرے اُس سوئچ بورڈ کی طرف کھسکنے لگا تھا اس کے بدن کا سارا بوجھ اس کی انگلی پر تھا، وہ پسینے پسینے ہوگیا تھا، اور آئلو ہوا میں معلّق پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

سوئچ بورڈ منٹو کی پہونچ سے اب بھی دور تھا، اور نیچے سے اٹھتی گرم گرم لپٹیں اسے جھلسائے دے رہی تھیں، اس کے پیروں کی چمڑی لال ہوگئی تھی، منٹو کو کچھ پتہ تو تھا نہیں کہ یہاں کون سا کام کس طرح ہوتا ہے، وہ تو صرف یہ سوچ کر آیا تھا کہ شاید وہ کچھ کر سکے، مگر اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس سے غلطی ہوگئی ہے۔

"اب جو بھی ہو، اچانک اس کے ذہن نے پلٹا کھایا"

"مرنا ٹھہرا، تو مروں گا ہی، ذرا چھو کر تو دیکھ ہی لوں"۔

اور اس خیال کے ساتھ ہی منٹو نے اپنے بدن کو ایک دم سیدھا کرلیا۔ اور پیروں کو لمبا تان کر سوئچ بورڈ پر ٹکانے کی کوشش کرنے لگا۔

"تڑاک .... ! ایک آواز ہوئی اور آئلو کو ایسا لگا کہ زمین کی گردش رُک گئی ہو، چاروں مینار جھک گئے تھے، اور نیچے سے بھاپ کے ایسے بادل اٹھنے لگے تھے کہ کہیں کچھ نظر نہ آتا تھا، منٹو بھی نہیں۔

"منٹو..... و..... و !" آئلو پاگلوں کی طرح چلائی اور دیوانوں

کی طرح خلاء میں ہاتھ پیر مارنے لگی۔

بھاپ کے بادل پورے تین دن تک چھائے رہے، اور آئلو اندھوں کی طرح منٹو کو ڈھونڈھتی رہی۔

اور جب بادل چھٹے تو آئلو نے دیکھا، تمام مشینی آدمی اپنی اپنی جگہ رُکے ہوئے ہیں، چولھے پر ابلتا سیّال ٹھنڈا ہو چکا ہے، اور منٹو اس کنوئیں جیسے چولھے کے پاس اوندھا پڑا ہے، اس کے پورے بدن پر آبلے اُٹھ آئے ہیں۔

تاروں کی جالی ٹوٹ چکی تھی، آئلو ایک ہی جھٹکے میں نیچے اُتر آئی اب کہیں کوئی رکاوٹ نہ تھی، اس نے دوڑ کر منٹو کو اٹھا لیا۔ وہ آبلوں کی جلن سے تڑپ رہا تھا، آئلو اپنے کمرے میں لا کر اس کے زخم صاف کرنے لگی۔

تین دن اور بیت گئے۔ منٹو اب بڑی حد تک ٹھیک ہو گیا تھا۔ ایک دن اس نے آئلو سے پوچھا:

"تمیل کا مطلب کیا ہوتا ہے۔؟"

"تم..... یہ شاید تمو سے بنا ہو گا،" آئلو کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"اور.... بل.... ؟"

"بدھو کہیں کے، بل تو سب جانتے ہیں، بل کا مطلب ہوا طاقت،

اس طرح تمو.... اور بل ..... ملا کر ہو گیا ہو گیا ہو گا" تمبل، یعنی کہ تمام طاقتوں والا۔"

"اچھا.... اور وہ شنکھ؟" منٹو نے پھر پوچھا:

"شنکھ؟ اوہ وہ ہریالی والا؟ نہیں اب کچھ نہیں، اب جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ تو تمھیں تمھارے گھر چھوڑ آؤں۔"

"کیوں؟ کیا میں تمھیں اچھا نہیں لگا؟" منٹو نے منہ بنا کر پوچھا:

"نہیں میرے بچے، ایسی بات نہیں، میرا بس چلتا تو ہمیشہ تمھیں اپنے ساتھ رکھتی، لیکن ....." آئلو رو ہانسی ہو گئی۔

آدھی رات کا وقت رہا ہو گا جب منٹو دھیرے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور پھر یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ آئلو سو رہی ہے۔ دبے پاؤں چلتا ہوا تمبل کے کمرے میں چلا آیا، اسے یاد تھا کہ زمین سے آتے وقت راستے میں اسے آئلو نے بتایا تھا کہ 'تمبل' نے اپنے کمرے کے تہہ خانے کے اندر وہ ہریالی کا شنکھ ڈال رکھا ہے۔ اور منٹو اسی لیے اس کے کمرے میں آیا تھا کہ شاید وہ 'شنکھ' اسے مل جائے، اور وہ اپنے ساتھ لائٹر بھی لیتا آیا تھا کہ اس کی مدد سے راستہ تلاش کر سکے گا۔ دوسری طرف اسے یہ بھی اندیشہ تھا کہ روشنی جلانے سے 'تمبل' کہیں جاگ نہ جائے۔

اِدھر اُدھر دیکھتے دیکھتے منٹو کی نظر زمین کے ایک کونے پر لگے ایک ننھے سے بٹن پر پڑی۔ اس نے سوچا کہ اُسے دبا کر دیکھوں، کیا پتہ! جیسے اچانک پیر کے انگوٹھے سے سوئچ دب جانے سے مشینی آدمی رُک گئے، تاروں کی جالی ٹوٹ گئی، اسی طرح کوئی معجزہ یہاں بھی ہو جائے۔

لیکن اگر ویسی ہی آواز یہاں بھی ہو گئی تو۔؟ تمیل جاگ جائے گا، اور نہ دبایا جائے تو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ یہ کیا ہے؟

رات گذرتی جا رہی تھی، منٹو نے کئی بار ہاتھ آگے بڑھائے اور پھر کھینچ لیے تھے، اسے آہٹ سی محسوس ہوئی، اور منٹو چھپنے کی کوشش کرنے لگا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ آلمو اسے تہہ خانے کے اندر نہیں جانے دے گی، وہ پیچھے کھسکنے لگا، اس کا پیر کسی چیز سے ٹکرا گیا، اور گر گیا، اس کے گرنے سے بٹن دبا اور زمین کے اندر کھڑکی سی کھل گئی، اب منٹو کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا، اسے تہہ خانے میں جانے کا راستہ مل گیا تھا، وہ دھڑام سے اندر کی طرف کود گیا اور بھاگتا چلا گیا—— راستہ سچ مچ خطرناک تھا، آلمو ٹھیک ہی کہتی تھی، راستے کے دونوں طرف بھیانک قسم کے کیکٹوں نما پودے تھے، جو دونوں طرف سے آدم خور پودوں کی طرح منٹو کی طرف جھکے آرہے

تھے، ان کی کانٹے دار پتّیاں اژدھے کے منہ کی طرح کھلنے لگی تھیں، اور بدبو کے مارے دم گھٹا جا رہا تھا، چاروں طرف خون کی بساندھ پھیلی معلوم ہوتی تھی، آگے خوفناک قسم کی، اونچی نیچی، آری جیسی دانتوں والی لال پہاڑیاں تھیں، پھر ایک سُرنگ شروع ہوتی تھی، سُرنگ ختم ہونے پر لمبا دالان شروع ہوتا تھا، اور دالان کے خاتمے پر ایک کمرہ تھا، اور اس کے بالکل بیچ میں ایک سفید پتھر کا چبوترہ تھا، اور اس پر وہ شنکھ رکھا ہوا تھا، اس پورے سیّارے پر یہی ایک سفید چیز نظر آتی تھی، چبوترہ، اور اس پر رکھا شنکھ۔

منٹو نے لائٹر سے اُن خوفناک پودوں کو آگ لگا دی، وہ جیسے ہی اسے دبوچنے کو آگے بڑھتے، منٹو لائٹر سامنے کر دیتا، اور وہ جلنے لگتے، ان کے جلنے سے موم جیسی کوئی چیز پگھل پگھل کر گرتی تھی۔

جلتے پودوں کے بیچ سے بھاگتا ہوا منٹو آخر اُس کمرے کے دروازے تک جا پہنچا، اب جلتے پودے بہت دُور ہو گئے تھے، منٹو نے اِدھر اُدھر دیکھا، کمرہ بند تھا، اس کی کھڑکیاں بہت اونچی تھیں، وہ اندر جاتا تو کیسے۔؟

اس نے دروازے کو زور زور سے دھکے مارنا اور جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھ زخمی ہو گئے اُن سے خون رسنے لگا، مگر

اس نے ہمّت نہیں ہاری... آخر دروازے کا شیشہ ٹوٹ گیا، اور منٹو اسی چھوٹے سے راستے سے اندر گھس گیا، اور دوڑ کر شنکھ اٹھالیا، اور اسے پھونکنے لگا، پھونکتا رہا، پھونکتا رہا.... رات گذر گئی دن آگیا مگر منٹو نہیں رُکا، یہاں تک کہ اس کی سانسیں چڑھ گئیں، منہ لال ہوکر سُوج گیا ——

اور پھر آسمان پر بادل گھر آئے، بارش ہونے لگی، تین دن تک ہوتی رہی۔ اور جب بارش رُکی تو تمام چیزیں دُھل کر صاف ہوگئی تھیں، کیکٹس کی آگ بجھ گئی تھی، درختوں کی شاخوں پر ہری، دھانی کونپلیں پھوٹ گئی تھیں، پہاڑ اپنے اصلی رنگ میں آکر نکھر گئے تھے۔ مٹی سے خون کی بساندھ کی بجائے سوندھی خوشبو اُٹھ کر چاروں طرف پھیل رہی تھی۔

آئلو نے وہاں پہنچ کر شنکھ سمیت منٹو کو اٹھالیا، منٹو پر بے ہوشی جیسی کیفیت طاری تھی، آئلو نے اسے بستر پر لٹایا اور اس کا سر سہلانے لگی، پھر اس کے بعد اس نے کمرے کی کھڑکی کھول دی، کھڑکی کے سامنے ایک درخت تھا اس پر ایک ننھی سی چڑیا آکر بیٹھ گئی تھی، پھر اس نے پر پھڑپھڑائے اور چہچہانے لگی،

تمبل اچانک چونک کر اُٹھ بیٹھا تھا، اور حیران نگاہوں سے

چاروں طرف دیکھ رہا تھا، کیونکہ اب سب کچھ بدلا ہوا تھا، وہ
اُٹھ کر کھڑا ہوگیا، پھر چبوترے سے نیچے اترا، اور دروازہ کھول کر
کمرے سے باہر نکل آیا۔ اب اس کا رُخ آئلو کے کمرے کی طرف تھا۔
آئلو منٹو کے سرہانے بیٹھی اس کا سر سہلا رہی تھی، تمبل کو آتے
دیکھ کر کھڑی ہوگئی۔

"یہ کون ہے؟" تمبل نے پوچھا:

"یہ منٹو ہے!" آئلو نے جواب دیا:

"مجھے کس نے سُلایا تھا۔؟" تمبل نے پوچھا:

"منٹو نے ہی سلایا تھا!" آئلو نے کہا:

ایک اور چڑیا وہاں اُس درخت پر آ گئی، پھر دونوں چڑیائیں
مل کر چہچہانے لگیں۔

تمبل نے خوش ہوکر تالی بجادی اور ہنسنے لگا، پھر ہنستا ہی چلا گیا۔
اور جب اس کی ہنسی رُکی، تو وہ رُونے لگا، خوب رویا، سارا دن ساری
رات روتا رہا، آئلو نے ہاتھ پکڑ کر اسے منٹو کے پاس بیٹھا دیا، اور بھیگے
کپڑے سے اس کا منہ پونچھ ڈالا، اب اس کا چہرہ دُھل کر صاف ہوگیا تھا،
اور دل ایک دم سے ہلکا ہوگیا تھا۔

اس نے منٹو کو اُٹھا کر اپنے سینے سے چمٹا لیا، اور اس کے گال چوم لیے۔

"پیارے انکل اب تم مشینی آدمی نہیں بناؤ گے نا۔؟" منٹو نے پوچھا:

"نہیں کبھی نہیں بناؤں گا۔" تمبل نے اسے اور زور سے سینے سے چپٹا لیا۔

"آؤ اب ہم لوٹ چلیں۔" آئلو بولی:

"میں گھر جاؤں گا ــــ" منٹو نے کہا:

تمبل نے اس کی طرف دیکھا اور اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔

"تم چلے جاؤ گے؟" تمبل نے بڑی حسرت سے کہا:

"آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں گے انکل۔"

"میں...... !" تمبل جیسے بڑی دور سے بولا:

"کیوں؟ کیا میں اچھا بچّہ نہیں ہوں؟" منٹو نے کہا:

"نہیں ... نہیں پیارے بچّے...... تم نے تو مجھے زندگی عطا کی ہے۔ مگر، مگر... وہاں میرا ہے ہی کون۔؟ کہاں جاؤں گا میں۔؟"

"کیا میں آپ کا کوئی نہیں؟ آپ ہمارے ساتھ چلیں گے، ہم سب ساتھ رہیں گے، پاپا، بوا، مَیں اور میری ممّی۔

ممّی ــــ؟ مگر تم نے تو کہا تھا کہ ...." آئلو نے کہا:

"کہا تھا، مگر اب میں نے اپنی ممّی ڈھونڈ لی ہے۔" منٹو نے جواب دیا:

اُدھر منٹو کے جانے کے بعد بُوا ایمو، نے رُو رُو کر بُرا حال کر لیا تھا۔ اُن کی حالت پاگلوں جیسی ہو گئی تھی۔ اور وہ ہر راہ چلتے کا راستہ روک کر کہتی پھرتی تھیں کہ

"میرے منٹو کو ڈھونڈھ کر لا دو، ہائے میں نے اس پر ظلم کیا، اسے بھیگے کپڑوں سمیت گھر سے باہر کھڑا رکھا، معاف کر دو مجھے، میرے پیارے بچّے اب گھر لوٹ آؤ۔"

وہ سمجھ رہی تھیں کہ ان کے ظلم سے تنگ آکر منٹو گھر چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ منٹو کے پاپا بھی دورے سے لوٹ آئے تھے۔، تھانے میں رپورٹ کی جا چکی تھی، ریڈیو، ٹی وی، اخباروں، ہر جگہ تلاش گمشدہ کے اشتہار دیے جا چکے تھے، آس پاس کے تمام علاقوں میں اس کی کھوج جاری تھی۔ پاپا نے کام پر جانا چھوڑ دیا تھا، بوا ایمو نے کھانا پکانا، گھر میں چولھا بھی نہ جلتا تھا۔ بُوا تو روتی یا گُم صُم بیٹھی آسمان کو تکا کرتیں۔ گھر میں سب اُداس ہو گئے تھے۔!

اوپر سے نیچے آتے ہوئے تمبل نے ایک بٹن دبایا اور گول طشتری جیسا خلائی جہاز گول گول گھوم کر ایک جگہ معلّق ہو گیا۔

"یہی میرا گاؤں ہے۔" تمبل نے نیچے والے علاقے کی طرف اشارہ کیا۔ پھر دوبارہ بولا: "کھیتوں میں دھان کی بالیاں کتنی اونچی ہو گئی ہیں۔؟"

"اور یہ سُورج مکھی کے کھیت ہیں، کتنے خوب صورت ہوتے ہیں یہ پھُول!" آئلو بولی۔

"اور میرے باغ میں یہ بڑے .... بڑے گلاب کھلتے ہیں۔" منٹو نے ہاتھوں کی تھالی سی بنالی ——

"گول جہاز اب دوسری طرف گھوم گیا تھا، تمبل نے ایک بہت خوب صورت علاقے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا:

"اور، وہ کیا ہے؟"

"یہ دوستی گھر ہے، جو بچّوں کے لیے بنایا گیا ہے، یہاں دُنیا کے ہر کونے کے بچّے اکٹھے ہو کر کھیل سکتے ہیں، اور ایک دوسرے سے دوستی کر سکتے ہیں۔" منٹو نے آنکھیں نچائیں!

گیہوں کے دانے بڑے ہو گئے ہیں، مویشیوں کا دُودھ بڑھ گیا ہے، دھان کی فصل اب سال میں دو تین بار اگائی جا سکتی ہے، اور سورج کی کرنوں کو قید کر لیا گیا ہے، ہم اس سے کھانا پکا سکتے ہیں؛ گاڑیاں بھی چلا سکتے ہیں، اور ترقی کے راستے پر چلنے والے ہیر انسانوں کے ہی ہیں۔" آئلو بولی:

گول جہاز پہاڑی ٹیلے پر آکر ٹھہر گیا تھا۔

"یہ وہی گرم چشمہ ہے۔" آئلو نے کہا:

"نہیں چاہیئے، نہیں چاہیئے.....!" تمبل نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپالیا۔

"آپ اُدھر دیکھئے توسہی، ٹھیک جہاں پر وہ آگ کا پھول کھلا کرتا تھا وہاں سے ٹھنڈے پانی کے فوّارے پھوٹ رہے ہیں" آئلو نے کہا:

تمبل نے اُدھر دیکھا، اور جُھک کر فوّارے کا پانی اپنے ہاتھوں میں لے لیا، اور پھر اُس پانی کو اپنے چہرے پر چھڑک کر دعا، مانگی۔

"اے خدا، اب کبھی یہ پانی گرم نہ ہو"

"اب ہم نیچے اتریں گے" آئلو بولی:

بُوا، بستر سے اٹھ کر باغ میں نکل آئی تھیں۔ انھیں کسی پل چین نہ تھا، منٹو کے پاپا پہلے سے ہی وہاں موجود تھے، وہ دونوں ہاتھوں کے بیچ سر دبائے بیٹھے ہوئے تھے۔ اور ان کی آنکھوں سے ٹپ، ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

دونوں نے ایک دوسرے کو اس طرح دیکھا، جیسے ایک دوسرے سے پُوچھ رہے ہوں کہ قصور کس کا ہے۔؟

اس وقت گھرڑر.... ر گھرڑر.... ر، کی آواز سُنائی دی، اور دونوں چونک پڑے، روشنی کا ایک ہالہ ٹیلے کی چوٹی پر لٹکا ہوا گول گول

گھوم رہا تھا۔

پھر اس میں سے تین سائے نکلتے دکھائی دیے۔ دونوں بہن بھائی ڈر کر ذرا پیچھے کھسک گئے۔

"کون ہیں یہ ....!" کیونکہ اتنی دور سے انھیں صرف سائے ہی دکھائی دے رہے تھے، پھر انھیں لگا کہ نیچے اترتے ہوئے ایک سائے کا پیر تھوڑا سا لڑکھڑایا پھر وہ سنبھل گیا۔

رات ڈھل رہی تھی، چاند نیچے کی طرف لڑھک رہا تھا، اور تین سائے نیچے کی طرف اتر رہے تھے۔

دھم.... کی آواز ہوئی اور سوکھے پتّے کھڑکھڑا اٹھے۔

"دیکھئے انکل، میرے باغ کے تالاب میں کتنا خوبصورت کنول، کھلا ہوا ہے۔!"

"یہ آواز تو منٹو کی ہے۔!" منٹو کے پاپا چونک کر بولے:

"ہاں.... یہ آواز منٹو کی ہی ہے ___" بوا ایمو بولیں:

"منٹو.... و.... و......!" سب ایک ساتھ پکار اٹھے:

"پاپا میں آ گیا ہوں.... وں....!" منٹو نے چلا کر جواب دیا:

اور گھر کے سارے لوگ جاگ کر اس طرف دوڑنے لگے تھے۔

اُدھر سے منٹو بھی دوڑا چلا آ رہا تھا۔

اس کے پیچھے دو سائے اور بھی تھے ——

دوڑتا ہوا منٹو اتنی زور سے پاپا کے سینے سے ٹکرایا کہ وہ گرتے گرتے بچے ——

اور پھر وہ منٹو کو سینے سے چمٹا کر رونے لگے ۔

بُوا امّو بھی رو رہی تھیں، بہنیں اور بھائی بھی، اور روتے روتے کہہ رہے تھے ۔!

"منٹو، ہمارے پیارے منٹو، اب کبھی ہمیں چھوڑ کر نہ جانا ۔"

سب بہت دیر تک روتے رہے، جب دل ہلکا ہو گیا تو چُپ ہو گئے اور پھر سب کے سب مسکرانے لگے ۔

کیونکہ منٹو نے سب کے آنسو پونچھ ڈالے تھے ۔

پھر منٹو نے اپنے پاپا کا جھکا ہوا چہرہ دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اوپر اُٹھایا، اور ان سے بولا :

"پاپا اُدھر تو دیکھو ۔"

پاپا نے اُدھر دیکھا۔ ان کے سامنے آنٹی کھڑی تھی، اُجلے سفید کپڑے پہنے، آنکھوں میں منٹو کے لیے بہت سا پیار لیے ہوئے ۔

"میں اپنے لیے ممّی لایا ہوں پاپا ۔"

اور یہ ہمارے انکل ہیں، اور پھر منٹو نے گھر سے نکلنے اور مریخ تک

تک پہنچنے کی کہانی پاپا اور بُوا ایمو، کو سنائی، اور پھر گزرے ہوئے تمام حالات سنائے۔

اب صبح ہونے کو تھی، دُور کہیں مُرغ کی بانگ گونج اُٹھی تھی، چڑیاں چہکنے لگی تھیں۔

"اب ہم سب ساتھ رہیں گے، ہے نا پاپا؟"

پاپا نے تمبل کی طرف دیکھا، آنلو کی طرف دیکھا، بُوا کی طرف اور ان کے تمام بچّوں کی طرف دیکھا ———

سب مسکرا رہے تھے۔

منٹو کی پیشانی چوم کر پاپا بھی ہنسنے لگے۔

منٹو سب کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر سب ہی کو ایک دوسرے کے قریب لے آیا تھا ———

اُس وقت بوا ایمو کو لگا۔

منٹو بہت بڑا ہو گیا ہے، اور اپنے مضبوط بازوؤں سے سب کو سہارا دیئے کھڑا ہے!!

اتحاد اور اتفاق

ایک ندی کے کنارے ایک بہت خوب صورت باغیچہ تھا۔ اس ندی کا پانی سونے کے رنگ کا تھا۔ اور اس کے ساتھ لگے ہوئے باغ میں مختلف قسم کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اور رنگ برنگی پنچھی اس باغ کے پیڑوں پر مل جل کر رہا کرتے تھے۔

اس باغ کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ بہار کے موسم میں اس باغ کو دیکھنے دُور دُور سے لوگ آیا کرتے تھے۔ اور اس باغ کے پھولوں پنچھیوں اور پیڑوں کا ملاپ دیکھ کر ہر شخص یہی خیال دل میں لے کر لوٹتا تھا کہ۔

"ہم بھی اپنے باغوں کو ایسے ہی سجائیں گے"۔

ایک بار چار بچّے اپنے ماں باپ کے ساتھ یہاں آئے۔ اور پھر انھوں نے یہ ٹھان لی کہ "اب وہ ہر چھٹی میں یہیں آیا کریں گے۔ اس سے اچھی اور کوئی جگہ نہیں ہے"۔

اور پھر ان چاروں نے مل کر ایک بڑی پیاری سی نظم لکھ ڈالی تھی۔
یہ شروع بہار کے دن تھے، پتّوں پر شبنم کی بوندیں چمک رہی تھیں
صبح کا وقت تھا اور سورج کا نارنگی گولا پہاڑوں کے پیچھے چھپا اپنی
آنکھیں مٹکا رہا تھا۔ اور کلیاں کھلنے کو دھیرے دھیرے منہ کھول
رہی تھیں۔ چڑیاں چہچہا رہی تھیں وہ اپنے گھونسلوں سے نکل کر ندی
کے کنارے جمع ہوگئیں۔ ندی کے سنہرے پانی میں ان سب نے ایک
ساتھ اپنی اپنی چونچیں ڈبو کر دھوئیں اور پھر سب دانہ چگنے لگیں۔
اشوک نے کہا: —"آہا ہا کتنا خوب صورت سماں ہے۔"
کرتار نے کہا: — "سچ کہتے ہو بھیّا، میرا تو گانا گانے کو دل چاہنے لگا۔"
شاہدہ بولی: — "تو گاؤ نہ، بہت دن ہوگئے تمہارا گانا سُنتے ہوئے۔"
رومی: — "کیسے پیارے پیارے پھُول کھلے ہوئے ہیں۔ اور
ان پر پڑی ہوئی اوس کی یہ موتیوں جیسی بوندیں۔"
شاہدہ بولی: — "تم نے ابھی تک صرف پھول ہی دیکھے ہیں؟ ذرا ان
چڑیوں کو بھی تو دیکھو۔ جو ہمارے باغ میں داخل ہوتے ہی خوشی کے
مارے چہک اٹھی ہیں، اور وہ ایک ننھی سی بھوری چڑیا پیپل کی اونچی
ڈالی پر بیٹھی کتنی غور سے ہماری باتیں سُن رہی ہے۔"
رومی: — "لیکن اب تو وقت بہت کم رہ گیا ہے، کچھ ہی دیر

میں دھوپ نکل آئے گی اور ہمیں گھر لوٹنا ہوگا۔"
اشوک نے کہا: "سورج نکل آئے گا تو کیا ہوا؟ آج تو ہماری چھٹی کا دن ہے۔"
کرتار نے کہا: ـــ "یہ بات تو ہم بھول ہی گئے تھے۔"
شاہدہ: ـــــ "پھر گانا شروع کرو نہ بھیا۔"
کرتار: ـــــ "شروع کون کرے گا۔؟"
شاہدہ: ـــــ شروع تم کرو گے، پھر ہم سب مل کر تمہارا ساتھ دیں گے۔"
کرتار: ـــــ "ٹھیک ہے۔ تم سب تیار ہونا۔؟"
سب ایک ساتھ: "ہاں ہاں ہم تیار ہیں۔"
کرتار نے گلا صاف کیا، اور گانا شروع کر دیا۔
کرتار: ـــــ "یہ ہمارا چمن۔"
اشوک: ـــــ "کتنا پیارا چمن۔"
رومی: ـــــ "جگنوؤں کے یہ جھلملاتے دیئے۔"
شاہدہ: ـــــ "رنگ برنگے ہیں پھول اس میں کھلے۔"
سب: ـــــ "یہ ہمارا چمن، کتنا پیارا چمن۔"
شاہدہ: ـــــ "ایک ہی ڈال کے پنچھی ہیں ہم۔"

"ہمیں کوئی شکوہ نہ کوئی ہے غم"

کرتار : "اونچے پیڑوں کی کیسی ہیں قطاریں کھڑی"

رومی : "لو صبح آگئی مسکراتی ہوئی"

سب : "آؤ ہم سب مل کر کھیلیں"

"اونچا اُٹھو، آکاش کو چھو لیں"

پھر تالیوں کی آوازیں گونج اٹھیں، اور چڑیاں زور زور سے چہچہانے لگیں تب تک باغ میں کچھ اور بچّے آ گئے تھے۔ سب مل کر خوب خوب کھیلے۔!

وقت گزر گیا۔ موسم ایک بار پھر بدلے بچّوں نے جی جان سے امتحان کی تیاریاں شروع کر دیں۔ امتحانوں کے موسم میں وہ سب کچھ بھول کر پڑھائی میں مصروف تھے۔ کچھ بچّے جنھیں امتحانوں کی پروا نہ تھی اور جو محض وقت گزاری کے لیے اسکول جایا کرتے تھے اب بھی کھیل کود میں لگے ہوئے تھے۔

اشوک، کرتار، رومی، اور شاہدہ، نے خوب جی لگا کر امتحان دیا، امتحان کے بعد اسکولوں کی چھٹیاں ہو گئیں تو اچانک انھیں وہ باغ یاد آیا اور پھر سب کے سب اُس طرف دوڑ پڑے۔

لیکن وہاں کا منظر دیکھ کر ان کے قدم باغ کے دروازے پر ہی

رُک گئے۔ بات ہی کچھ ایسی تھی۔

بڑی دیر تک چاروں دوست ایک دوسرے کا منھ دیکھتے رہے۔

"ہم راستہ بھُول کر کہیں اور تو نہیں آنکلے ؟" لیکن کچھ دیر بعد انھیں احساس ہوا، وہ راستہ نہیں بھُولے، بلکہ سچ مچ اس باغ کے نظارے بدل چکے ہیں، اب ویرانی کے سوا کچھ نہیں بچا۔ لیکن یہ ہوا کیسے ؟ ؟"

بھاری بھاری قدموں سے بچّے باغ کے اندر داخل ہوئے تو انھوں نے دیکھا۔ وہ ننھی سی بھُوری چڑیا آج بھی اُسی پیپل کی ڈال پر اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ لیکن آج اس کا چہرہ بہت اداس تھا، اس کی آنکھوں کے کنارے والے ننھے ننھے رُوئیں دار پر کچھ گیلے گیلے سے تھے ایسا لگتا تھا کہ وہ بہت روئی ہے۔

بچّوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ چل کر اسی چڑیا سے کچھ باتیں کریں' لیکن پھر انھیں ڈر سا لگا کہ انھیں اپنی طرف آتے دیکھ کر کہیں وہ ڈر کر اُڑ نہ جائے۔

انھیں ایک ہلکی سی آواز سنائی دی۔

"آؤ بچّو اندر آجاؤ" بچّوں نے چونک کر دیکھا انھیں کوئی نظر نہیں آیا۔

"یہ میں ہوں، بچو" یہ آواز پیپل کے پیڑ کی طرف سے آرہی تھی۔
بچوں نے دیکھا بھوری چڑیا انھیں بلا رہی ہے۔
بچے دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گئے۔ وہ ڈری نہیں، بولی۔
"مجھے تمہارا ہی انتظار تھا پیارے بچو، تاکہ اس چمن کے اجڑنے کی داستان تمہیں سُنا سکوں، اور میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔"
"کہو نا بھوری چڑیا، ہم تو خود بھی تمہارے پاس آنا چاہتے تھے تاکہ تم سے پوچھیں کہ یہ سب کیا ہو گیا؟ پھول مُرجھا کیوں گئے؟ درخت سوکھ کیوں گئے۔؟ اور اس باغ کے وہ پیارے پیارے پنچھی کہاں چلے گئے۔؟ مگر ہمیں ڈر لگتا تھا کہ کہیں تم بھی نہ اڑ جاؤ —"
بھوری چڑیا نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔
"بیٹھ جاؤ میرے دوستو، اور مجھ سے اس چمن کی بربادی کی داستان سنو —"
اور بھوری چڑیا کہنے لگی۔

—— • • • ——

"اُس دن جب تم یہاں آئے اور کھیل کود کر ہمیں اپنا گیت سُنا کر لوٹ گئے اس کے کچھ ہی دیر بعد ہم تمام چڑیاں دانہ چگنے اکٹھی ہو کر ایک طرف کو اڑنے لگیں، اڑتے اڑتے اچانک "لال مینا" رُک کر

اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

مینا: —"کیا بات ہے لالی، تم کیوں رُک گئیں۔؟"

لال مینا: "کوئی کراہ رہا ہے شاید!"

کوئل: —"ہمارا کوئی ساتھی تو نہیں۔..."

کوّا: —"نہیں یہ ہمارے باغ کا پنچھی نہیں، لیکن ہے ہمارے ہی جیسا"

طوطا: —"آگے چل کر دیکھیں تو سہی۔ چوٹ کھایا ہوا معلوم ہوتا ہے"

بگلا: —"کیا میں اسے اپنی چونچ میں اُٹھالاؤں۔؟"

کبوتر: —"ہم سب ساتھ چلیں گے بھائی"

اور پھر سب مل کر ساتھ ساتھ اُسی طرف چلنے لگے جدھر سے کراہنے کی آواز آرہی تھی۔

تھوڑی دُور آگے چلنے پر انھیں معلوم ہوا، ایک سفید رنگ کا بڑا سا پرندہ، ندی کے کنارے ابھری ہوئی چٹانوں کے بیچ کی درار میں پھنسا ہوا ہے۔

"ہائے کسی نے اسے مار گرایا ہے" کوّا بولا۔

"اس کے پنکھ ٹوٹ گئے ہیں —" مینا بولی:

"یہ بے ہوش ہو گیا ہے —" طوطا بولا:

"ہم سب کو مل کر اسے اٹھانا ہوگا —" کبوتر نے کہا:

"میں کہیں سے دوا کی شیشی اٹھا لاتی ہوں" گوریّا نے کہا:

"میں کھجور کے پتّے توڑ لاتی ہوں اس کا بستر بنالیں گے" لال مینا پھُدک کر اڑ گئی کھجور کے پتّے لانے ـــــ

ـــــ ٥ ❊ ٥ ـــــ

کئی دن بیت گئے وہ سفید پنچھی اب بہت حد تک تندرست ہو چکا تھا۔ اس کے زخم خاصے بھر چکے تھے، اور وہ اپنے نرم نرم بستر پر آرام سے لیٹا ہوا تھا ـــــ

تمام پنچھیوں نے مل کر اس کی خوب خدمت کی تھی، اس کے سامنے پھلوں اور اناج کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔

طوطا بولا: ـــــ "لو یہ امرود تو کھاؤ بھیّا، ایک دم پکے ہوئے ہیں اور بہت میٹھے"

گوریّا بولی: ـــــ "اور یہ باریک سفید چاول بھی تو لو ـ"

بگلا بولا: ـــــ "میں مچھلیاں بھی لایا ہوں، خوب اچھی تازہ تازہ"

کبوتر بولا: ـــــ "اور یہ پیلی پیلی سرسوں...."

مور بولا: ـــــ "پیٹ بھر کر کھا لو تو میں تمھیں اپنا ناچ دکھاؤں گا، دیکھو بادل آرہے ہیں ـــــ"

بلبل بولی: ـــــ "میں تمھیں گانا سناؤں گی"

بٹکوئیں[1] بولی: ـــــ "اور میں تالاب کی سیر کراؤں گی، (بٹکوئیں کا حاشیہ اگلے صفحہ پر)

گلابی کنول کی کشتی میں بٹھا کر خوب گھماؤں گی۔"

سفید پنچھی اب ایک دم تندرست تھا، اس کے نئے نئے پر اُگ آئے تھے، ٹوٹے بازو کی ہڈیاں جڑ چکی تھیں۔ لیکن باغ کے تمام پنچھی اب بھی اس کی خدمت میں جٹے رہتے تھے۔ کیونکہ مہمانوں کی خدمت کرنا وہ اپنا سب سے پہلا فرض سمجھتے تھے۔

ایک دن وہ کھاپی کر لیٹا ہوا تھا کہ ننھی بٹکوئیں اس کے پاس آگئی۔ اور بولی۔

بٹکوئیں: — "چلو بھیّا، تمھیں تالاب کی سیر کرا لاؤں۔"

مور: — "کیا ناچ دیکھو گے۔؟"

پنچھی: — "نہیں بھائی مور، اور پیاری بٹکوئیں، مجھے اس وقت آرام کرنے دو۔ شام کو جہاں لے چلو گے چلوں گا۔"

مور اور بٹکوئیں، یہ سُن کر وہاں سے چلے آئے اور شام کا انتظار کرنے لگے — اور پھر دھیرے دھیرے شام نے اپنی سنہری سرخی مائل باہیں پھیلا دیں —

لہ بٹکوئیں، نیلے، سنہرے اور لال رنگوں والی ایک بے حد خوب صورت چڑیا ہوتی ہے جو کنول کے پھولوں کو بے حد پیار کرتی ہے اور ہمیشہ اسی تالاب کے آس پاس گھومتی ہے جس میں کنول، کے پھول اگتے ہوں۔

سفید پنچھی ننھی بٹکوئیں کے ساتھ کنول، کے پھولوں کی کشتی پر بیٹھا ہوا تھا۔ تالاب کے کنارے کھڑے ہوئے کھجور کے پیڑ سے پکی ہوئی کھجوریں ٹپک پڑیں ___

" آہا ہا۔ کھجوریں پکنے لگیں۔! اب میں اپنے مور بھیّا کے لیے بہت ساری کھجوریں جمع کروں گی۔"

بٹکوئیں کی بات سُن کر سفید پنچھی نے پہلے تالاب کے پانی میں جھانکا پھر پورے چمن پر نظر دوڑائی اور پھر ایک لمبی سانس لے کر بولا۔

پنچھی: ___ " آں ہاں .... یہاں کی تو ہر چیز بہت ہی اچھی ہے۔ سوائے اس کمبخت مور کے .....

بٹکوئیں: ___ " کیوں کیا ہوا میرے مور بھیّا کو ___ ؟"

سفید پنچھی: ___ " چھوڑو بھی بہن اس بات کو، جان کر تمھیں دُکھ ہی ہوگا۔"

بٹکوئیں: ___ " کچھ کہو گے بھی یا یونہی پہیلیاں بجھاتے رہو گے۔؟"

سفید پنچھی: ___ " اری پیاری بٹکوئیں۔ تم اتنی معصوم ہو کہ کیا کہوں۔

بٹکوئیں: ___ " اب کہہ بھی دو، ہمارے اندر کوئی کمی ہوگی تو ہم اسے دُور کرنے کی کوشش کریں گے۔

سفید پنچھی: ___ " مگر وہ بے ہودہ باز آنے والا نہیں۔ یہ تو تم ہی ہو کہ اسے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ تم جو اسے بھیّا بھیّا کہتے اپنا گلا سُکھاتی ہو۔

پتہ ہے وہ تمھارے بارے میں کیا کہتا ہے۔؟ اور تم تو یہ بھی نہیں سمجھ پائیں کہ دوپہر کو میں تمھارے ساتھ سیر کرنے کیوں نہیں آیا ــــــ"

بٹکوئیں : ــــــ " تمہیں آرام کرنا تھا اس لیے۔ اور یہ تم نے ہمارے بھائی کو گالی کیوں دی؟ ــــ تم اگر ہمارے مہمان نہ ہوتے تو سچ کہتی ہوں میرا تم سے اتنا جھگڑا ہوتا اتنا کہ بس ــــــ"

سفید پنچھی : ــــــ " مجھ سے جھگڑ کر تمہیں کیا ملے گا، میں تو تمہارے بھلے کی کہتا ہوں، تمہیں جھگڑنا تو اس سے چاہیئے جو تمھیں الٹی سیدھی کہتا ہے۔ اُس دن جب میں تمھارے ساتھ سیر کرکے لوٹا تو جانتی ہو اس نے مجھے کتنی باتیں سُنائی تھیں۔ تمہارے پیچھے ہمیشہ شکایت کرتا ہے تمھاری۔ کہتا ہے۔
" اس نگوڑی بٹکوئیں نے تو جادو کر دیا ہے آپ پر۔ جانے کیا سمجھتی ہے خود کو گندی چڑیا۔ ہمیشہ تالابوں کی کیچڑ میں لتھڑی رہتی ہے۔ کیا دھرا ہے اس کے کیچڑ بھرے تالاب میں۔

ایسا کہتے ہوئے وہ بھول گیا کہ جس بارش کو دیکھ کر وہ خوشی سے جُھوم اٹھتا ہے۔ اس کا پانی تمھارے ہی تالاب میں جمع ہوتا ہے۔ تمھارے ہی تالاب کے پانی سے اس کی پیاس بجھتی ہے ــــــ

بٹکوئیں : ــــــ " نہیں میں یہ نہیں مانوں گی، موربھیّا ایسا نہیں کہہ سکتے ہم سب ایک ہی باغ کے پنچھی ہیں۔ ایک ساتھ پلے بڑھے، ایک ہی

ڈال پر جھولا جھولے۔ ایک ساتھ دانہ چگا۔ ایک ساتھ گھونسلے بنائے —— آپ نے جو بھی سنا ہے وہ ایک دم سے بے بنیاد بات ہے ایسا ہو ہی نہیں سکتا ——" بلکوئیں بڑے جوش سے بولی!

سفید پنچھی : —" تم نہ مانو، مگر سچ یہی ہے، جو میں نے کہا ہے۔

"تم سُن رہے ہونا میرے پیارے بچّو؟" بھوری چڑیا نے کہتے کہتے رک کر بچّوں سے پوچھا: ——

"ہاں.... ہاں.... ہم سُن رہے ہیں"، "مگر پیاری چڑیا یہ تو بتاؤ کہ اُس سفید پنچھی نے ایسا کیوں کیا؟" سب نے ایک ساتھ پوچھا:

"اس لیے کہ اس سفید پنچھی کے دل میں لالچ سما گئی تھی۔ اور اس چمن کی خوب صورتی دیکھ کر وہ اس پر اپنا قبضہ جمانے کی سوچنے لگا تھا۔ اور تمام چڑیوں کو غلام بنا کر ان سے اپنی خدمت کرانا چاہتا تھا، مگر وہ اپنے ارادے میں اُس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا تھا، جب تک کہ آپس میں پھوٹ ڈلوا کر انھیں ایک دوسرے سے بدگمان نہ کر دیتا۔

اچھا تو اب آگے کی سُنو"

آسمان پر کالے کالے بادل گھر آئے تھے۔ ننھی ننھی بوندیں جلترنگ بجانے لگی تھیں۔ قطرے ٹپ ٹپ زمین پر گر رہے تھے۔ اور مور مست ہو کر ناچ رہا تھا۔

اچانک اس کے قدم رُک گئے ـــــ باغ کے پرندوں کے بیچ
میں اسے بٹکوئیں کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی ـــــ

مور : ـــــ " ارے یہ کیا ؟ میری پیاری بٹکوئیں کہاں ہے۔؟ اسے
تو دُنیا کی تمام چیزوں سے پیارا میرا ناچ ہے۔ کیا اسے یاد نہیں رہا
کہ آج میں نے اپنے مہمان کی صحتیابی کی خوشی میں اپنا سب سے
اچھا رقص پیش کرنے کی ٹھانی ہے۔"

مور کو پریشان دیکھ کر وہ سفید پنچھی دھیرے سے کھسک کر اس کے
قریب آ گیا۔

سفید پنچھی : ـــــ "کیا بات ہے مور بھائی رُک کیوں گئے۔؟"

مُور : ـــــ " میری پیاری بٹکوئیں، جواب تک نہیں آئی ۔ وہ
آجائے تو ناچوں گا ـــــ"

سفید پنچھی : ـــــ " اس معمولی چڑیا کی خاطر تمھیں اپنا اتنا خوبصورت
ناچ روکنے کی کیا ضرورت ہے بھلا ـــــ"

مور : ـــــ " وہ میری پیاری بہن ہے۔ تم نے اسے معمولی چڑیا
کہہ کر اس کی اور ہم سب کی بے عزّتی کی ہے جناب۔ آپ کو ایسا
نہیں کہنا چاہیے تھا۔"

سفید پنچھی : ـــــ " ارے بھائی بگڑتے کیوں ہو؟ میں تو تمھارے ہی لیے

کہہ رہا تھا، پھر بادلوں کا موسم گزر جائے گا۔ اور تمھارا ناچ ادھورا رہ جائے گا۔ کیونکہ میں جان گیا ہوں کہ تمہاری ٹیلکوئیں، تمہارا ناچ دیکھنے نہیں آئے گی۔ جانتے ہو کل شام اس نے کیا کہا تھا۔؟"

مور: ـــــ "کیا کہا تھا میری پیاری ٹیلکوئیں نے، کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے جو میری بہن مجھ سے روٹھ گئی۔؟ میں ابھی جاکر اسے منا لاؤں گا۔"

سفید پنچھی: ـــــ "بھائی مور تمہارے جذبات دیکھ کر اب میں تمھیں پوری بات بتانے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ بات یہ ہے کہ اسے اپنے کیچڑ بھرے تالاب اور کیچڑ میں اگنے والے کنول کے پھولوں پر بہت ناز ہے ـــ کہتی تھی کہ ـــ

"یہ مور مجھے زبردستی اپنا ناچ دکھاتا ہے، ورنہ مجھے تو اس کے بھدّے پیروں کو دیکھ کر اُبکائی آتی ہے، میرے تالاب میں اپنی گندی چونچ ڈبو کر اسے غلیظ بنا ڈالتا ہے۔ مجھے جبراً اس کا جوٹھا پانی پینا پڑتا ہے، پانی پی کر دیر تک مجھے متلی سی ہوتی رہتی ہے، اپنے کو بہت ہی خوب صورت سمجھتا ہے بھونڈا کہیں کا۔" "تم نہیں جانتے ہو مور بھائی اس کی باتیں سُن کر مجھے کتنا دُکھ ہوا ہے۔ میں تو اسے بڑی معصوم سمجھتا تھا، مگر وہ بڑی کائیاں نکلی ـــ غضب خدا کا، کیسا الزام تھوپ ڈالا

تم پر کہ تم نے اس کے تالاب پر قبضہ جما رکھا ہے۔ بھول گئی اس بات کو کہ اس باغ کی سینچائی میں تم نے بھی اپنا پسینہ بہایا ہے۔"

مور: ـــ "نہیں یہ باتیں قطعی غلط ہیں۔ وہ ایسا نہیں کہہ سکتی۔"

سفید پنچھی: ـــ "تو خود ہی آزمالو نہ، تمہارے بلانے پر اگر وہ چلی آئی تو سمجھوں گا میں نے ہی غلط سنا ہے۔" "اور کیا یہ مینا شکایتیں نہیں کرتی؟"

تو پھر ایسا ہوا ـــ بھوری چڑیا ذرا سا گلا کھنکار کر بولی: کیونکہ بولتے بولتے اب اس کا گلا سوکھنے لگا تھا۔

"کبوتر بے چارا امن پسند تھا وہ مور بھیّا کو ساتھ لے کر بٹکوئیں کے گھر گیا۔

کبوتر: ـــ "بٹکوئیں بہن .... او بٹکوئیں بہن، دروازہ تو کھولو..... یہ دیکھو کون آیا ہے۔ تمہارے گھر ـــ"

بٹکوئیں: ـــ "باہر ہی رہو کبوتر میاں، کیا غٹر غوں کرتے آگئے میرا دماغ خراب کرنے۔"

مور: ـــ "ذرا گھونسلے سے باہر تو آؤ پیاری بہن مجھ سے جو غلطی ہو گئی ہو اسے معاف کر دو ـــ"

بٹکوئیں ـــ "خبردار، جو مجھے اب کبھی بہن کہا ـــ میں تجھ جیسوں کا منہ کبھی نہیں دیکھنا چاہتی۔"

مور: ——— "اب کیا کریں کبوتر بھائی" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

طوطا: ——— "ایک بار پھر کوشش کر لو ———"

مینا: ——— "جاؤ، جاؤ، میاں اُلّو مل، اپنی سوچ دوسروں کی چھوڑ دو"

تمھیں میری آواز بُری لگتی ہے نا ——— میرے پر بدصورت اور مَٹ میلے ہیں نا؟ جاؤ سنبھال کر رکھو اپنی کدال جیسی چونچ کو"

کبوتر: ——— "پیاری بہنو اور بھائیو آخر تمھیں ہو کیا گیا ہے۔ ؟ جو اس طرح آپس میں لڑ رہے ہو۔ ؟"

بلبل: ——— "ارے اب چُپ بھی رہ غٹر غوں کا بچہ آواز تو حُقّے کی گڑگڑی جیسی، اور چلا ہے۔ "میگھ ملہار گانے"

کوئل: ——— "اری او...... اب چپ بھی کر، تو کون سی دودھ کی دُھلی بیٹھی ہے۔ ؟"

بھوری چڑیا کی آنکھوں سے آنسو کی دو بوندیں نکل کر پیڑ کے پتّوں پر جم گئیں۔

بات کچھ یوں تھی۔ اس سفید پنچھی نے بٹکوئیں کے دل میں مور کے خلاف اتنی نفرت بھر دی تھی کہ ہزار کوششوں کے بعد بھی وہ اس سے ملنے کو تیار نہیں ہوئی۔ اور مور کی شکایت بگلے سے بھی کر دی۔ بگلے نے

پھر وہ بات مور سے کہی۔ طوطے نے مینا کی شکایتیں کیں۔ بلبل نے کوئل کی۔ اس طرح سبھوں کے دل میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت کا پودا اُگ آیا۔ جس کے پھل بڑے زہریلے ہوتے ہیں۔ اور بڑے بڑوں کو مار ڈالتے ہیں۔

سفید پنچھی مہمان بن کر آیا اور ہمارا یہ ہرا بھرا چمن اُجاڑ گیا۔ کاش..... ہمارے ساتھی اس کی باتوں میں نہ آئے ہوتے۔ اور ایک دوسرے سے مل کر ایک دوسرے کے دل کی بات جان لیتے۔ اور ان کی غلط فہمی دور ہو جاتی؛

ہمارا چمن اُجڑ گیا اور میں بے بس یہ سارا تماشہ دیکھتی رہ گئی۔ ان ہنگاموں میں میری آواز کون سنتا بھلا۔ ہے'

اپنے آباؤ اجداد کی روائتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم سب نے مل کر اس سفید پنچھی کی خدمت کی۔ اسے اس لائق بنایا کہ وہ چل پھر سکے۔ اور اس نے اپنی مکّار ہنستی ہوئی آنکھوں سے ہمارے اجڑنے کا تماشہ دیکھا۔ اب وہ اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کرنے گیا ہے۔ کچھ ہی دیر میں وہ اپنی فوج لے کر آئے گا اور پھر یہ چمن ہمیشہ کے لیے اس کے قبضے میں ہو گا۔ اور باغ کے سارے پنچھی اس کے غلام بن جائیں گے؛

بولو بچّو تم بھی تو کبھی ایسا نہ کر بیٹھو گے۔ ۶ دوسرے کے بہکاوے

میں آکر اپنا وطن تو نہ اجاڑ ڈالو گے۔"

بچے: ——"نہیں ہرگز نہیں !"

سب بچے: ——"ہم ایسا کبھی نہیں ہونے دیں گے۔"

اچانک آسمان پر پھڑپھڑاہٹوں کی آواز گونج اٹھیں۔ یہ بہت سارے پنچھی تھے۔ بھوری چڑیا نے سہم کر اُوپر دیکھا۔ پھر مُسکرا اٹھی۔

اُوپر اڑنے والے پنچھی اس کے اپنے ساتھی تھے۔ شاید ان سب نے بھوری چڑیا اور بچوں کی باتیں سُن لی تھیں۔ اور ان کی سمجھ میں اصل بات آگئی تھی۔ اب وہ سب ایک ساتھ نیچے اترنے لگے۔ طوطے میاں سب کے آگے تھے۔ شاید انھوں نے ہی ان سب کو اصل بات بتائی تھی۔ یوں بھی طوطے زیادہ ذہین ہوا کرتے ہیں۔ اور ہر بات انھیں یاد رہتی ہے۔ ان سب کے اوپر سایہ کیے ہوئے کبوتر امن کا پرچم لہراتا چلا آرہا تھا۔

سارے پنچھی اب نیچے اُتر آئے تھے پھر وہ سب مل کر بھوری چڑیا کے پاس گئے۔ اور بولے۔

"پیاری بہن ہم تمھارے شکر گزار ہیں کہ آج تمھاری وجہ سے ہم ایک بار پھر مل بیٹھے ہیں۔ تم اتنے دن تک بھوکی پیاسی اسی ڈالی پر اس انتظار میں بیٹھی رہیں کہ کہیں سے کوئی آجائے اور تم ان سے کہہ کر

اپنی بات ہم تک پہنچا سکو۔

آج ہم سب مل کر یہ عہد کرتے ہیں کہ کبھی کسی کے بہکاوے میں نہ آئیں گے۔ اب ہماری ایکتا کو کوئی نہیں توڑ سکے گا؛

چلو جلدی کرو۔ وہ پنچھی اب آتا ہی ہوگا، ہم سب کو مل کر اس کا اور اس کی فوج کا مقابلہ کرنا ہے ——"

تب تک وہ پنچھی آچکا تھا، اس کے ساتھ بہت بڑی فوج تھی۔ لیکن ہمارے چمن والے اب مضبوط تھے۔ ان سب نے مل کر ان کی پوری فوج کا مقابلہ کیا، بچّوں نے پتّھر برسائے۔ آخر وہ ڈر کر بھاگ گئے۔ اب تمام چڑیوں اور بچّوں نے مل کر خوب خوشیاں منائیں۔ چڑیوں اور بچّوں نے گیت گائے اور مور خوب خوب ناچا ——

ننّھی بٹکوئیں بہت ساری مونگ پھلیاں لے آئی۔ گوریّا چاول لائی۔ بگلا مچھلی لایا۔ طوطے نے امرودوں کے ڈھیر لگا دیئے۔

پھر سب نے مل کر کھانا کھایا۔ اور پورا چمن ایک نعرے سے گونج اٹھا۔ "یہ ہمارا چمن، کتنا پیارا چمن........

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

نوٹ: طلبہ و اساتذہ کے لیے خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

ISBN: 978-81-7587-343-8

कौमी काउन्सिल बराए फ़रोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025